میں بزدل تھا اور وہ مر گیا ہے تم زندہ رہو

جرم و سراغ رسانی کی دو طویل کہانیاں
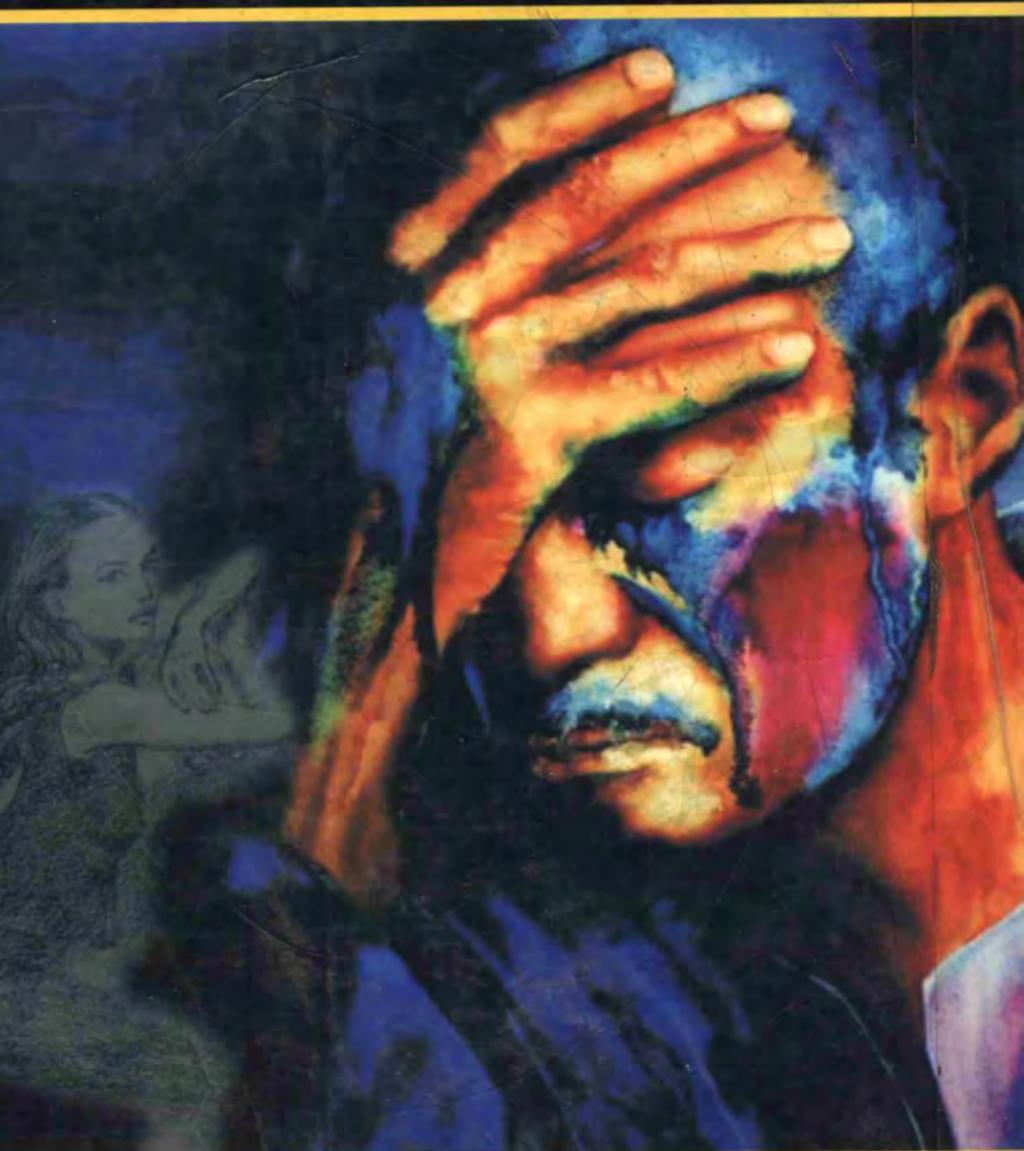
رئیس الدین، علی اظہر، عزیز احمد، عنایت اللہ

پیش لفظ

بھارت کے ایک قیدی کیمپ سے پاک فوج کے پانچ افسروں کے فرار کی کہانی — "فتح گڑھ سے فرار" — آپ پڑھ چکے ہیں۔ اب ایک شہری کے فرار کی داستان پڑھیے — "میں بزدل تھا"

یہ ہیں رئیس الدین جو کہتے ہیں کہ وہ بزدل ہوا کرتے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران وہ اپنی بیوی کا گلا گھونٹ کر گھر سے فرار ہوئے اور فوج میں بھرتی ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء میں اپنی دوسری بیوی کے ساتھ ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتلِ عام سے بھاگے اور مشرقی پاکستان چلے گئے۔ ہجرت کے راستے میں اپنی جوان بیوی کو چار ہندوؤں سے چھڑا کر اور انہیں قتل کر کے اُن کی بزدلی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

دسمبر ۱۹۷۱ء میں وہ مشرقی پاکستان میں پاک فوج کو سامان سپلائی کرتے رہے۔ ۱۶ دسمبر کا منحوس دن آ گیا۔ رئیس الدین نے قسم کھا لی کہ ہندو کے قیدی نہیں بنیں گے۔ وہ مشرقی پاکستان سے نکلے اور جن خطروں میں وہ ہندو کے دیس میں سے گزر کر لاہور پہنچے، ان کے تصوّر سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

رئیس الدین کے تینوں فرار جن کی تفصیل علی اظہر نے قلمبند کی ہے، ایک نفسیاتی مطالعہ بھی ہے اور ایسی کہانی جو آپ کے جذبات میں ہلچل مچا دے گی اور بعض واقعات تو جسم پر کپکپی طاری کر دیتے ہیں۔

اس کتاب میں آپ کو ایک اور کہانی ملے گی — "وہ مر گیا ہے، تم زندہ رہو"۔ یہ ایک بزرگ کی سچی آپ بیتی ہے جو برِّصغیر کے ایک مشہور سرکس میں قلاباز ہوا کرتے تھے۔ وہ سرکس میں ہی پیدا ہوتے تھے۔ سرکس کی دنیا کا یہ خونی اور جذباتی

ڈرامہ نہ جانے کہاں جا ختم ہوتا، لیکن ایک رات ایک شیر پنجرے سے نکل آیا۔ اس نے ڈرامے کو وہاں جا ختم کیا جہاں کسی کو توقع نہیں تھی کہ یوں بھی ہوگا۔

یہ کہانی مجھے سُنائی گئی اور میں نے قلمبند کی ہے۔

کہتے ہیں حقیقت افسانے سے دلچسپ ہوتی ہے۔ یہ دو تو حقیقی کہانیاں پڑھیں تو آپ کو یہ حقیقت صرف دلچسپ ہی نہیں لگے گی بلکہ آپ چونک چونک اُٹھیں گے اور آپ محسوس کریں گے کہ آپ اِن کہانیوں میں تنکے کی طرح بہے چلے جا رہے ہیں اور آپ اپنی مرضی اور اپنے زور سے کہیں رُک نہیں سکتے۔

عنایت اللہ
یکم دسمبر ۱۹۷۹ء

میں بُزدِل تھا

راوی: رئیس الدین
تحریر: علی اظہر

میں رئیس الدین سے پہلی بار ملا تو انہیں اپنے کُنبے کے لئے پریشان پایا۔ انہیں صرف یہ اطمینان تھا کہ ان کے گھر کا ہر ایک فرد زندہ ہے اور بھارت کی قید میں ہے۔ ان کے ساتھ ان کی خط و کتابت بھی شروع ہو گئی تھی۔ کراچی ان کا اپنا کوئی عزیز نہیں تھا اور نہ ان کی بیوی کا کوئی عزیز تھا۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کے آخر میں ان کا کنبہ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی قید میں چلا گیا۔ رئیس الدین گھر میں نہیں تھے۔ پاک فوج کی ایک پلٹن کے ساتھ مشرقی پاکستان کے ایک مشہور شہر بوگرا میں تھے۔ اپنی فوج کی انہوں نے بہت مدد کی تھی۔ ہتھیار ڈالنے کا حکم ملا تو رئیس الدین وہاں سے نکل گئے۔ رات کے اندھیرے اور افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ جنگل میں چلے گئے۔ جنوری ۱۹۷۲ء کے آخری ہفتے تک جنگلوں اور دلدل میں بھٹکتے اور بھارت میں داخل ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر ایک رات انہوں نے سرحد پار کر لی۔ چھ ماہ بعد دریائے راوی میں ڈبکیاں لگاتے اور تیرتے پاکستان میں داخل ہوئے۔

مجھے اُن کے فرار کے متعلق پتہ چل چکا تھا۔ میں نے یہ کہانی قلم بند کرنے کی پیش کش کی تو وہ مان گئے اور ہم نے وقت مقرر کر لیا۔ میں جب کہانی ریکارڈ کرنے کے لئے اُن کے پاس بیٹھا تو انہوں نے کہا — "یہ میرا پہلا فرار نہیں۔ میں اس سے پہلے دو مرتبہ فرار ہو چکا ہوں۔ پہلی بار ۱۹۴۷ء میں بھارت کے ایک شہر میں اپنی بیوی کو قتل

کر کے بھاگا تھا۔ پھر ۱۹۴۷ء میں اپنی دوسری بیوی کے ساتھ بھارت سے بھاگ کر مشرقی پاکستان گیا تھا۔ اور اب ۱۹۷۲ء میں وہاں سے بھاگ کر یہاں آیا ہوں۔ اب کہیں اور بھاگ کر جانے کی ہمت نہیں"۔

میں "بیوی کے قتل" پر چونکا۔ قدرتی طور پر اشتیاق پیدا ہوا کہ رئیس الدین ۱۹۴۳ء سے اپنی کہانی سنائیں۔ یکے بعد دیگرے چار نشستوں میں انہوں نے جو آپ بیتی سنائی وہ میں انہی کی زبان سے پیش کرتا ہوں۔

"تین مرتبہ فرار سے آپ مرعوب نہ ہو جائیں۔ میں دلیر اور نڈر آدمی نہیں ہوں۔ میں بزدل انسان ہوا کرتا تھا، بلکہ بزدل خاوند کہیئے تو اچھا رہے گا۔ میں مشرقی پنجاب (بھارت) کا رہنے والا ہوں۔ دس جماعتیں پڑھ کر ایک سرکاری دفتر میں کلرک لگ گیا تھا۔ صرف ایک شادی شدہ بہن تھی جس کے دو بچے تھے۔ میری عمر بیس سال تھی جب میرے والد صاحب فوت ہوئے۔ ان کی وفات کے ایک سال بعد میری شادی ہو گئی۔ شادی کے سات ماہ بعد والدہ فوت ہو گئیں۔ بہن اپنے سسرال میں آباد اور مطمئن تھی۔ میں اکیلا رہ گیا۔ میری بیوی تھی مگر ایسی بد دماغ بیوی کہ میں اپنے آپ کو اکیلا ہی سمجھتا تھا۔ اس نے پہلی رات ہی مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ اس گھر میں اُس کا حکم چلے گا، اور میں نے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ میری تین کمزوریاں تھیں۔ ایک یہ کہ میری بیوی خوب صورت تھی۔ دوسری یہ کہ میری شکل و صورت ایسی تھی جو کسی خوبصورت لڑکی کو پسند نہیں آ سکتی تھی اور تیسری یہ کہ میں دنیا میں اکیلا رہ گیا تھا۔ میری حمایت میں بولنے والا کوئی نہ تھا۔ میری بیوی کھاتے پیتے گھرانے کی تھی۔ دراصل میری سب سے بڑی کمزوری تو یہ تھی کہ میرے دل میں بیوی کی محبت پیدا ہو گئی تھی......

"وہ دُبلی پتلی نازک سی لڑکی تھی مگر خوب صورت پتھر تھی۔ مجھے دیکھ کر اُس کے چہرے پر کبھی مسکراہٹ نہیں آئی تھی۔ ذرا سی بات پر منہ بسور لیتی تھی۔ میں ذرا سا اونچا بولوں تو وہ رونے لگتی یا مجھ پر برس پڑتی تھی۔ وُہ مجھے خاوند بھی صرف اُس وقت سمجھتی تھی جب وہ چاہتی تھی ورنہ میری حیثیت ایک نوکر کی سی تھی۔ بیگم صاحبہ جس طرح

چاہتی تھیں مجھے استعمال کرتی تھیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مجھے اس کا یہی رویہ پسند آنے لگا۔ کبھی کبھی حسرت سی ہوتی تھی کہ میری محبّت کے جواب میں وہ بھی کبھی محبت کا اظہار کرے۔ میں باہر سے آؤں تو مسکرا کر مجھے دیکھے مگر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا کبھی دھوکا بھی میں نے نہ دیکھا۔ تین چار مرتبہ ایسے ہُوا کہ میں نے اسے کہا — "کیا میں اتنا ہی بُرا ہوں کہ تمہارے دل میں میرے لئے نفرت کے سوا کچھ ہے ہی نہیں ؟"۔ اُس نے اتنے خوب صورت چہرے پر نفرت کے گھناؤنے تاثرات پیدا کر کے جواب دیا — "بُری تو میری قسمت ہے۔ میں چاہتی کیا تھی اور مجھے ملا کیا"۔ یہ جواب اُس نے صرف ایک مرتبہ دیا۔ باقی جتنی مرتبہ بھی میں نے کوئی ایسا شکوہ کیا تو وہ حقارت سے منہ پھیر کر باورچی خانے یا کمرے میں چلی گئی......

"میں روز بروز بُزدل ہوتا گیا اور اُسے خوش رکھنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ ہمارا مکان والد صاحب مرحوم کے نام تھا۔ ایک روز خیال آیا کہ مکان اپنے نام کرا لینا چاہیئے۔ میں نے کرا لیا اور جب بیوی کو بتایا کہ یہ مکان میرے نام ہو گیا ہے تو اُس نے کہا۔ "تمہارے نام ہُوا ہو گا، میرا تو نہیں"۔ میں نے مکان اس کے نام رجسٹری کرا دیا مگر اُس کے رویّے میں کوئی فرق نہ آیا۔ اگر فرق آیا تو یہ آیا کہ اس کا رویّہ اور زیادہ خراب ہو گیا۔ اُس نے مجھے دھتکارنا شروع کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس لڑکی کے والدین نے اس کا رشتہ مجھے کیوں دیا تھا۔ اُن کی نظر میرے مکان پر تھی۔ مجھ میں ذرہ بھر جرأت نہیں تھی کہ بیوی کے غصّے کا جواب غصّے سے دے سکتا۔ مَیں اپنی اس کمزوری کو سمجھ گیا کہ میں بزدل ہُوں۔ میری بزدلی اتنی بڑھ گئی کہ وہ مجھ پر اس طرح رعب جھاڑنے لگی جیسے میں اس کا غلام تھا۔ میں سر جھکا لیتا اور ہونٹ سی کر اُس کی پھٹکار سنتا رہتا۔ میں نے تنہائی میں کئی بار سوچا کہ وہ صرف اس لیے سر چڑھ گئی ہے کہ مَیں اس کی واہی تباہی سُنتا رہتا ہوں۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اسے ڈانٹ پلا کر چُپ کرا دوں گا مگر وقت آیا تو مَیں اس طرح بُجھ کے رہ گیا جیسے دہکتے انگارے پر پانی پھینکا دیا جاتا ہے......

"پھر مجھے باہر کے لوگوں سے اپنے گھر کے متعلق باتیں معلوم ہونے لگیں۔ میرے

دوستوں نے مجھے صاف الفاظ میں زن مرید کہا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ میری بیوی نے کسی کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ میری یہ حالت ہوئی جیسے میرے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ میں شام گھر گیا تو یہ ارادہ کر گیا کہ آج بیوی سے دو ٹوک بات کروں گا اور یہ بھی کہوں گا کہ میں اسے پسند نہیں تو طلاق لے لے مگر میں بیوی کے سامنے گیا تو میری زبان کھل ہی نہ سکی۔ بڑی مشکل سے بات شروع کی جو اُس نے بے رُخی سے سنی۔ میں نے آخر وہ بات کہ دی جو میں کہتے ڈرتا تھا کہ بیوی آسمان سر پر اٹھا لے گی لیکن اُس نے جیسے بات سنی ہی نہ ہو۔ میں نے پھر کھل کر کہا —— "اگر تم کسی دوسرے کے ساتھ ناجائز تعلقات رکھنا چاہتی ہو تو مجھے دھوکے میں نہ رکھو" —— اُس نے نہایت اطمینان سے جواب دیا —— "کیا تم اپنے آپ کو مرد سمجھتے ہو؟ ...... تم بزدل ہو۔ مجھے بزدل مردوں سے نفرت ہے۔ اگر ہمّت ہے تو مجھے طلاق دے کر دیکھ لو" .....

"میرے غصّے پر پانی پڑ گیا۔ میں طلاق کی دھمکی دینے کی بجائے اُس کے آگے جھک گیا اور اُس کی منت سماجت کرنے لگا۔ میں نے اس سے محبت کی بھیک مانگی اور گڑگڑا کر التجا کی کہ وہ کسی اور سے محبت نہ کرے۔ اس نے حاکموں کی طرح مجھے حکم دیا کہ میں آئندہ ایسی بکواس نہ کیا کروں۔ میری بزدلی دیکھئے کہ میں نے بیوی سے یہ بھی نہ پوچھا کہ کیا میرا شک صحیح ہے یا غلط؟ میں نے اس کا حکم مان لیا اور یہ وعدہ کیا کہ آئندہ میرے منہ سے ایسی بات نہیں نکلے گی میں اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ میں بزدل ہوں۔ اگر مجھ میں مردانگی ہوتی تو یہ خوبصورت لڑکی مجھ سے محبت کرتی میں دلیر بننے کی ترکیبیں سوچنے لگا اور دوستوں سے بھی پوچھا کہ دلیری کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ دوستوں نے مجھے اُلّو بنانا شروع کر دیا۔ انھوں نے ایک ناٹک بھی کھیلا۔ میرے دفتر کا ایک کلرک جوگی بن گیا۔ میں اُسے اس بہروپ میں پہچان نہ سکا۔ میرے دو ساتھی رات کو مجھے اُس کے پاس لے جاتے۔ وہ مجھے ٹونے ٹوٹکے بتاتا اور خاصے پیسے جھاڑ لیتا۔ چند دنوں بعد ان کا پول کھل گیا لیکن میں اُن کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں پیدائشی بزدل ہوں اور میرا کوئی علاج نہیں سوائے اس کے کہ بیوی کے قدموں میں بیٹھا رہوں اور کتے کی زندگی بسر کرتا رہوں....

"ایک روز دفتر میں مجھے پیٹ میں ایسا شدید درد اٹھا کہ مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ دوائی لے کر میں گھر چلا گیا —— دروازہ کھُلا۔ بیوی نے کھولا تھا۔ اندر گیا تو وہی آدمی بیٹھا تھا جس کے متعلق مجھے بتایا گیا تھا کہ میری بیوی کی اُس سے آشنائی ہے۔ وہ مجھے تپاک سے ملا۔ بیوی نے پوچھا کہ میں اتنی جلدی دفتر سے کیوں آ گیا ہوں۔ میں رو پڑا اور کہا کہ پیٹ میں درد ہے۔ بیوی نے مجھے لٹا دیا۔ دلچسپی سے میرا حال پوچھا۔ میری دوائی دیکھی اور میرا پیٹ ملنے بیٹھ گئی۔ اس کی اتنی سی دلچسپی کا یہ اثر ہُوا کہ میں یہ بھی بھول گیا کہ اُس نے ایک غیر مرد کو اندر بٹھا رکھا ہے اور یہ مجھے دھوکا دے رہی ہے۔ میرے آنسو بہتے رہے۔ میں نے بیوی کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوما اور اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ اس دوران وہ آدمی چلا گیا.....

"دس گیارہ روز بعد کا واقعہ ہے کہ میری بیوی نے مجھے بتایا کہ میری بہن آئی تھی۔ اس نے میری بیوی کو (میری بیوی کے بیان کے مطابق) یہ الفاظ کہے —— "تم میرے بھائی کی شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو۔ وہ بھلا مانس تمہیں کچھ کہتا نہیں۔ تم نے اس سے مکان بھی لے لیا ہے اور غیر مردوں کے ساتھ گلچھرے اڑا رہی ہو" ——

میری بیوی نے مجھے خوب ڈانٹ پلائی اور حکم دیا کہ میں بہن کو کہہ آؤں کہ وہ یہاں نہ آیا کرے۔ میں اُسی وقت چلا گیا۔ بہن سے ملا تو اُس نے بتایا کہ وہ دن کے وقت میرے گھر گئی تو وہی آدمی میری بیوی کے پاس تھا۔ میری بہن کو دیکھ کر وہ چلا گیا اور میری بیوی نے میری بہن کی بے عزّتی کی اور اسے گھر سے نکال دیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ میرے خون میں اُبال پیدا ہُوا۔ بہن نے مجھے کہا —— "تم میرے باپ کی نشانی ہو اور وہ گھر میرے لئے زیارت گاہ ہے جہاں ہم پیدا ہوئے تھے۔ اس طوائف نے وہ گھر ناپاک کر دیا ہے" ——

میں چپ چاپ وہاں سے نکل آیا۔ گھر آیا تو بیوی نے پوچھا —— "اُسے کہہ آئے ہو کہ یہاں نہ آیا کرے؟" —— میں نے جواب دیا "نہیں۔ میں نے اسے کہا ہے کہ میری غیر حاضری میں یہاں نہ آیا کرے" —— بیوی نے عادت کے مطابق ملکہ کی طرح کہا —— "وہ یہاں نہیں آئے گی۔ یہاں صرف وہ آئے گا جسے میں پسند کروں گی" ——

"رات گہری ہو گئی تھی۔ میں نے بیوی کے ساتھ مزید بحث نہ کی۔ اس نے کچھ اور بکواس بھی کی جو میں نے دوسرے کان سے نکال دی۔ یہ چڑیل ایسی بُری طرح میری رگوں پر سوار تھی کہ میں اس کا سامنا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ اور زیادہ بھڑک اٹھی اور چیخنے لگی "تم بولتے کیوں نہیں ہو" ــــ میں بالکل ہی دب کے رہ گیا جیسے میں مر گیا ہوں۔ اُس نے کہا ــــ "تم بزدل، ہیجڑے، اتنے غیرت والے کہاں تھے۔ تمہاری اپنی بہن یاروں نے لگاتی پھرتی ہے" ــــ میں بتا نہیں سکتا کہ میرے اندر یہ سُن کر کیا ہُوا۔ بہن کی بے عزتی نے میری غیرت کو جگا دیا۔ میرے اندر ہم پھٹا یا بگولا اٹھا اور میں دنیا سے اس طرح بے خبر ہو گیا جیسے بے ہوش ہو گیا ہوں۔ ہوش آیا تو بیوی کی گردن میرے ہاتھوں میں تھی۔ اس کی آنکھیں باہر آ گئی تھیں، منہ کھل گیا تھا اور زبان اُس کے دانتوں تلے دبی ہوئی تھی۔ میری انگلیوں کا شکنجہ بڑا سخت تھا۔ میں نے اپنے آپ میں آ کر ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ بیوی دھڑام سے گری۔ میں نے اسے قتل کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ میں نے ایسی کوئی بات سوچی بھی نہیں تھی۔ میں نے کبھی مکھی بھی نہیں ماری تھی۔ میں اسے آوازیں دینے اور ہلانے لگا مگر وہ نہ بولی۔ میں نے اپنے آپ کو یہ دھوکا دیا کہ یہ مری نہیں نہ میں نے اسے مارا ہے۔ اسے کچھ اور ہو گیا ہے۔

"میرا دماغ جواب دے گیا۔ میں نے دوڑ کر پڑوسی کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اسے یہ کہہ کر اپنے گھر لے گیا کہ میری بیوی کو کچھ ہو گیا ہے۔ اس نے میری بیوی کو فرش پر پڑے دیکھا تو ڈر گیا۔ اُس نے نبض اور دل پر ہاتھ رکھا اور بتایا کہ یہ تو مر گئی ہے۔ وہ چالیس سال سے زیادہ عمر کا آدمی تھا۔ اس نے پوچھا "تم کہاں تھے؟ اس کا تو کوئی گلا گھونٹ گیا ہے" ــــ قتل ایسا جرم ہے جو شاید کوئی پیشہ ور قاتل ہی ہضم کر سکتا ہو گا۔ میرے منہ سے نکل گیا "میں گھر میں ہی تھا۔ میں نے غصے میں آ کر اس کی گردن دبائی تھی" ــــ اُس نے حیرت سے کہا ــــ "تم نے اسے قتل کر دیا ہے۔ کمبخت، یہ تو مر گئی ہے" ــــ کمرہ گھومنے لگا۔ میں نے ایک نظر بیوی کی لاش پر ڈالی۔ مجھے ایسے دکھائی دیا جیسے اس کا چہرہ میرا چہرہ ہے اور مجھے پھانسی دے دی گئی ہے۔ میری آنکھیں اور زبان باہر نکلی ہوئی ہے۔ میں نے اور کچھ نہیں سوچا۔ اپنے پڑوسی کو وہیں چھوڑ کر دوسرے کمرے میں گیا۔ بیوی کا سوٹ کیس کھولا۔ کپڑوں کے نیچے اُس نے پیسے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے نہیں دیکھا کہ کتنے ہیں۔ سارے پیسے جیب میں ڈالے اور جتنی تیز دوڑ سکتا تھا دوڑ کر

گھر سے نکل گیا۔ میں نے نہیں دیکھا کہ پڑوسی نے مجھے دیکھا تھا یا نہیں۔ مجھ پر جو پاگل پن سوار ہو گیا تھا وہ اتر گیا اور میری عقل ٹھکانے آ گئی تھی۔ میرے سامنے اب ایک ہی راستہ تھا۔ فرار کا راستہ....

"رات اندھیری تھی۔ میرا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ لوگ ابھی جاگ رہے تھے۔ ہر آدمی پر مجھے شک ہوتا تھا کہ اسے معلوم ہے کہ میں اپنی بیوی کو قتل کر کے بھاگ رہا ہوں۔ میں دوڑنے سے ڈرتا تھا۔ آہستہ چلنے سے بھی ڈرتا تھا۔ یہ ارادہ بھی دل میں آیا کہ تھانے جا کر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دوں، لیکن پھانسی کے خوف نے تھانے کی طرف نہ جانے دیا۔ میں ڈرتا تھا کہ پھانسی سے میری بھی زبان اور آنکھیں باہر آ جائیں گی۔ یہ بھی سوچا کہ بہن کے گھر جا چھپوں۔ بہن ہے، چھپائے رکھے گی مگر کب تک؟ شہر سے بھاگ جانا ہی بہتر سمجھا۔ اگر میں دلیر ہوتا تو عقل ٹھکانے رہتی اور میں فرار کی کوئی محفوظ صورت سوچ لیتا۔ میرا تو دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ پولیس کے سپاہی کو دیکھا۔ راستے میں کھڑا تھا۔ میرا جسم سُن ہو گیا۔ پاؤں من من کے ہو گئے۔ ہمت جواب دے گئی۔ نجات کی یہی صورت سمجھ میں آئی کہ اس سپاہی سے جا کر کہوں کہ تم جس مفرور قاتل کو ڈھونڈ رہے ہو، وہ میں ہوں۔ جسم پسینے میں نہانے لگا۔ سپاہی نے میری طرف دیکھا۔ میں الٹے پاؤں بھاگا اور ایک اندھیری گلی میں گھس گیا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا شہر سے نکل گیا۔ آگے ریلوے لائن آ گئی۔ جیب میں پیسے کافی تھے۔ میں کسی دور دراز جگہ کا ٹکٹ خرید سکتا تھا لیکن اس ڈر سے سٹیشن کا رُخ نہ کیا کہ پڑوسی نے اتنی دیر میں تھانے میں اطلاع دے دی ہو گی اور پولیس ریلوے سٹیشن پر پہنچ چکی ہو گی تاکہ میں شہر سے نکل نہ جاؤں....

"میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ سٹیشن کے اُلٹی طرف چل پڑا۔ شہر دور ہوتا گیا۔ میں چلتا گیا۔ پیچھے سے ایک ریل گاڑی آئی۔ میں لائن سے ہٹ کر پرے چلا گیا تاکہ انجن کی روشنی مجھ پر نہ پڑے۔ میں نے یہ ارادہ بھی کیا کہ گاڑی کی رفتار تیز نہ ہوئی تو چڑھ جاؤں گا۔ میں ایک جھاڑی کی اوٹ میں چھپ گیا۔ گاڑی قریب آ گئی لیکن رفتار بہت تیز تھی۔ گاڑی گزر گئی۔ رات پھر اندھیری ہو گئی۔ میں چل پڑا۔ خوف نے جسم کی طاقت چوس

لی۔ سر چکرانے لگا۔ اچانک پیچھے قدموں کی آواز سنائی دی۔ ایک یا زیادہ آدمی آرہے تھے میں
دوڑنے لگا تھا لیکن اس خیال سے نہ دوڑا کہ اگر ان آدمیوں کو میرے متعلق کچھ بھی علم نہ ہُوا تو
بھی شک کریں گے۔ میں نے رفتار سست کر لی۔ اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنائی دے رہی
تھی۔ دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ مجھ سے صبر نہ ہُوا۔ رک کر پیچھے دیکھا۔ قدموں کی آوازیں خاموش
ہوگئیں۔ کیا یہ میرے ذہن کی آوازیں تھیں؟ نہیں۔ میں نے آوازیں سنی تھیں۔ میں پیچھے
کو چل پڑا۔ اندھیرے میں کوئی بیٹھا ہُوا نظر آیا۔ میں اس کے قریب جانے سے ڈرتا تھا۔ وہ
بیٹھا رہا اور میں رکا رہا.....

"میں پھر اسی طرف چل پڑا جدھر چلا جا رہا تھا۔ ہر چند قدم چل کر میں پیچھے دیکھتا تھا۔
اب قدموں کی آہٹ میرا تعاقب نہیں کر رہی تھی۔ تھوڑی دور جا کر مجھے اپنے پیچھے ایسی
آہٹ سنائی دینے لگی جیسے کوئی قدم گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہا ہو۔ میں نے فوراً رُک
کر پیچھے دیکھا۔ آہٹ خاموش ہوگئی۔ میرے پیچھے ضرور کوئی آدمی تھا —— کیا وہ میرا
تعاقب کر رہا تھا یا میرا وہم تھا — میں نے اپنے ڈوبتے دل کو سہارا دینے کے لئے بلند آواز
سے کہا۔ کون ہو بھائی۔ میرے ساتھ آجاؤ۔ اکٹھے چلیں گے۔ مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ میں پھر
چل پڑا۔ آگے گیا تو ہوا میں معلق، بالکل سامنے، مجھے دو آنکھیں نظر آئیں پھر اپنی بیوی کا چہرہ
دکھائی دیا۔ آنکھیں اُبل کر باہر کو آئی ہوئی تھیں۔ میرا جسم بڑی زور سے کانپا اور میں رُک
گیا۔ بہت کوشش کی کہ اُدھر سے نظریں ہٹا لوں، لیکن ہٹا نہ سکا۔ ان آنکھوں نے مجھے وہیں
جکڑ لیا۔ میں غش کھا کر گرنے لگا تھا کہ آنکھیں پھیلنے لگیں اور پھر پھیل کر تیز روشنی بن گئیں۔ یہ روشنی
مجھ پر پڑنے لگیں اور مجھے بڑی زور سے گڑگڑاہٹ سنائی دینے لگیں۔ روشنی کرنوں میں بدل
گئی اور یہ کرنیں حرکت کرنے لگیں۔ تب میں نے دیکھا کہ آگے سے گاڑی آرہی تھی۔ دُور آگے
لائن کا موڑ تھا اور وہاں درختوں کے جھنڈ تھے۔ دُور سے انجن کی بتی کی روشنی ان
درختوں میں سے مجھے دو آنکھوں کی طرح دکھائی دی تھی۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا اور میں تیز تیز چلنے لگا۔

"میں جب درختوں میں سے گزر رہا تھا تو مجھے ایک بار پھر اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ
سنائی دی۔ میں رُک گیا تو آہٹ بھی رُک گئی۔ میں چل پڑا تو آہٹ پھر سنائی دینے لگی۔ میں نے
رُک کر پیچھے دیکھا۔ میں درختوں میں تھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے اور

وہ کسی درخت کے تنے کے پیچھے چھپ گیا ہے۔ یہ تو میں آج کہہ رہا ہوں کہ وہ میرے اپنے
قدموں کی آوازیں تھیں جنہیں میں کسی اور کی آہٹ سمجھ رہا تھا لیکن وہ وقت۔ تیس سال
گزر گئے، یاد آتا ہے تو آج بھی ڈر جاتا ہوں۔ اُس وقت وہ آوازیں مجھے حقیقی لگتی تھیں۔
میں وہاں کھڑا سوچ رہا تھا کہ یہ آدمی کون ہو سکتا ہے۔ وہ کوئی رہزن بھی ہو سکتا تھا۔
اچانک اُلو کی منحوس آواز سنائی دی میرے سر کے اوپر درخت پر بیٹھا بول رہا تھا۔ خوف
سے میں زمین میں گڑ گیا۔ آواز کی نحوست بتا رہی تھی کہ میں پکڑا جاؤں گا۔ اچانک میرے جسم میں
جان آگئی۔ میں لائن کے ساتھ ساتھ دوڑ پڑا مگر زیادہ دور تک نہ دوڑ سکا۔ ٹانگیں جواب
دے گئیں اور میں اس طرح بیٹھ گیا جیسے کوئی گر پڑتا ہے.....

"دماغ چکرا رہا تھا۔ ایک ارادہ یہ بھی دل میں آیا کہ اب گاڑی آئے گی تو اس کے آگے
لیٹ جاؤں گا، مگر دل نے ساتھ نہ دیا۔ پھر اپنے آپ کو یہ دھوکا دیا کہ خواب دیکھ رہا ہوں۔
اچانک بہت ہی تیز قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں سوچ بھی نہ سکا کہ کیا کروں۔ آوازیں
بے حد تیزی سے میرے قریب سے گزر گئیں۔ معلوم نہیں یہ دو بھیڑیئے تھے، گیدڑ تھے یا خنزیر۔
ایک آگے بھاگا جا رہا تھا اور دُوسرا اس کے تعاقب میں تھا۔ میری رگ رگ بیدار ہوگئی۔
مجھے درندوں کا خیال آگیا۔ میں اُٹھا اور چل پڑا۔ دور سے مجھے دو سُرخ روشنیاں نظر آئیں۔
ایک نیچے اور دوسری ذرا اوپر تھی۔ یہ دو سُرخ ستاروں کی طرح نظر آتی تھیں۔
اس سے آگے بھی تین چار ایسی بتیاں تھیں۔ سمجھنے میں دیر نہ لگی، یہ ایک چھوٹا سا ریلوے سٹیشن
تھا۔ میں ذرا تیز چلنے لگا۔ بتیاں دور ہی ہٹتی جا رہی تھیں۔ میں چلتا گیا۔ بہت دیر بعد میں پہلی
دو بتیوں کے نیچے پہنچ گیا۔ یہ باہر کا سگنل تھا۔ میں اس قدر تھک گیا تھا کہ ایک قدم اور چلنے
کی ہمت نہ رہی مگر مجھے ریلوے سٹیشن تک پہنچنا تھا۔ میں قدم گھسیٹتا گیا۔ پھر وہی خوف دل پر آ
گیا کہ اس سٹیشن پر بھی پولیس موجود ہوگی۔ میں نے یہ سوچا کہ یہ چھوٹا سا سٹیشن ہے۔ روشنی ناکافی ہے۔
اندھیرے میں جا کر دیکھوں گا کہ وہاں پولیس کا کوئی سپاہی ہے یا نہیں.....

"سٹیشن تک میں پہنچ گیا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ ایک جگہ دو دیہاتی بیٹھے نظر آئے۔ ان سے
پوچھا کہ وہ کونسی گاڑی کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ جالندھر جا رہے ہیں۔

ایک پسنجر ٹرین آ رہی تھی۔ میں نے اندھیرے میں سٹیشن پہ گھوم کر دیکھ لیا۔ پولیس کا نشان تک نہ ملا۔ کچھ دیر بعد ٹکٹوں والی کھڑکی کھلی۔ میں نے رومال اس طرح منہ اور ناک پہ رکھ لیا جیسے زکام ہو۔ میں نے امرتسر کا ٹکٹ لیا اور وہاں سے غائب ہو گیا۔ یہ جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ گاڑیوں میں بہت رش ہوتا تھا۔ گاڑی آئی اور میں ایک ڈبے میں سوار ہو گیا۔ بہت سے مسافر اونگھ رہے تھے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا۔ مجھ پر یہ خوف طاری ہو گیا کہ سب نے مجھے پہچان لیا ہے کہ میں بیوی کو قتل کر کے بھاگا ہوا ہوں۔ جی میں آئی کہ گاڑی سے نکل بھاگوں۔ یہ سوچتے سوچتے گاڑی چل پڑی اور میں فرش پر بیٹھ گیا۔ سیٹوں پہ کوئی جگہ نہیں تھی۔ نیند سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔۔۔۔۔

"اچانک دو مضبوط ہاتھوں نے میری دونوں کلائیاں پکڑ لیں۔ پولیس کے دو سپاہیوں نے مجھے پکڑ لیا تھا اور گھسیٹ رہے تھے۔ میں ان کی منت سماجت کرنے لگا اور انہیں بتانے لگا کہ میری بیوی میری عزّت کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اور میں نے غیرت کی خاطر اسے قتل کیا ہے۔ سپاہی خاموش تھے۔ وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے ایسی جگہ لے گئے جہاں فرش پر میری بیوی کی لاش پڑی تھی۔ اُس کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ زبان باہر لٹک رہی تھی اور اس کا چہرہ سیاہ کالا ہو گیا تھا۔ کسی نے پیچھے سے میری گردن مضبوط ہاتھوں میں دبا لی۔ شکنجہ تنگ ہونے لگا اور میں تڑپنے لگا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا پھر روشنی ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ میں بہت سے لوگوں کے درمیان بیٹھا ہوا ہوں۔ دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔ حلق میں کوئی چیز اٹکی ہوئی تھی۔ میں جلدی سے ہاتھ اپنی گردن پہ لے گیا۔ گردن پر کسی اور کے ہاتھ نہیں تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ میں گاڑی کے فرش پر بیٹھا تھا اور گاڑی چلی جا رہی تھی۔ ایسا بھیانک خواب دیکھا کہ پھر سونے کی جرأت نہ کی۔۔۔۔

"سفر کوئی زیادہ لمبا تو نہیں تھا لیکن خوف اور خطرے کی وجہ سے یہ سال بھر لمبا ہو گیا دوسرے دن کا پچھلا پہر تھا جب گاڑی امرتسر پہنچی اور میں سٹیشن سے باہر نکلا۔ ایک ہوٹل سے کھانا کھایا۔ دن کی روشنی میں چلتے پھرتے ڈر تو لگتا تھا لیکن رات والا خوف نہیں تھا۔ ایک مسجد میں جا کر غسل کیا اور خدا کے حضور سجدے کرنے لگا۔ یاد نہیں کہ میں نے کتنے نفل پڑھ ڈالے۔ پھر خدا کے حضور ہاتھ پھیلا کر میں بہت رویا۔ خدا کو میرے دل

کا حال معلوم تھا۔ میں نے خدا سے کہا کہ تیری ذات باری کو معلوم ہے کہ میں بیوی کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے قتل کیا بھی ہے تو بیگناہ میں باہر نکل گیا۔ پولیس کے سپاہی کو جہاں دیکھتا تھا۔ میں وہ راستہ ہی چھوڑ دیتا تھا۔ اپنے شہر سے اتنی دور آ جانے سے، عبادت اور دُعا سے اور پیٹ بھر کر کھانا کھا لینے سے میرے دماغ میں سوچنے کی طاقت واپس آ گئی۔ پہلی بات یہ ذہن میں آئی کہ میرے گھر میں میرا ایک فوٹو ہے۔ پولیس یہ فوٹو ہر طرف بھیج دے گی۔ میں سوچنے لگا کہ کیا کیا جائے اور کہاں کا رُخ کیا جائے۔ یہی ترکیب دماغ میں آئی کہ صوبے سے نکلا جائے۔۔۔

"گھومتے پھرتے رات آ گئی۔ جیب میں پیسے تھے چھوٹے سے ایک ہوٹل میں رات گزاری، مگر میں سو نہ سکا۔ جونہی آنکھ لگتی بیوی کی لاش سامنے آ جاتی اور دو ہاتھ میری گردن کو دبوچ لیتے۔ میں ہڑبڑا کر جاگ اٹھتا۔ اندھیرے کمرے میں میں نے بیوی کی باہر نکلی ہوئی آنکھیں بھی دیکھیں اور باقی رات کانپتے اور کلمہ پڑھتے گزار دی۔ صبح ناشتہ کر کے ہوٹل والے کو رات کے پیسے ادا کئے اور آوارہ گردی کے لئے نکل گیا۔ دماغ میں یہی ایک سوچ تھی کہ صوبے سے نکلا جائے۔ صوبہ سرحد کا خیال آیا۔ پٹھانوں کے متعلق بہت سی کہانیاں سنی تھیں۔ یہ بھی سنا تھا کہ مفرور قاتلوں کو وہ پناہ میں لے لیتے ہیں۔ میری کچھ ڈھارس بندھی۔ میں نے دل میں طے کر لیا کہ پٹھانوں کو بتاؤں گا کہ میری بیوی بدکار تھی اس لئے اسے قتل کر آیا ہوں۔ پٹھان چونکہ غیرت مند ہوتے ہیں، اس لئے مجھے پناہ دے دیں گے۔۔۔۔۔

"ایک آدمی نے مجھے روک لیا۔ میں ڈر گیا۔ اُس نے یہ پوچھ کر کہ کہاں کے رہنے والے ہو اور کیا کام کرتے ہو، میری جان نکال دی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا جواب دُوں۔ اُس نے خود ہی یہ کہہ کر میرا خوف دور کر دیا کہ فوج میں بھرتی ہونا چاہتے ہو؟ اور پوچھا۔ 'پڑھے ہوئے ہو؟'۔۔۔ میں نے جواب دیا کہ دس جماعت پاس ہوں۔ اُس نے مجھے فوجی نوکری کے متعلق سبز باغ دکھانے شروع کر دیئے۔ میں نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ بھرتی ہو جاؤں گا۔۔۔۔۔۔ آپ شاید حیران ہوں گے کہ یہ آدمی اچانک کہاں سے ٹپک پڑا جس نے مجھے عین اُس وقت فوج میں بھرتی کے لئے کہا جب میں پناہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ یہ قصّہ یوں تھا کہ وہ ۴۳-۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا جب جنگِ عظیم زوروں پر تھی۔ فوجی مکھیوں کی طرح مر رہے

تھے۔ بھرتی کی یہ حالت تھی کہ جو نوجوان چلنے پھرنے کے قابل ہوتا تھا اسے بھرتی کر لیتے تھے۔
بھرتی کی رفتار اور زیادہ تیز کرنے کے لئے حکومت نے یہ طریقہ بھی اختیار کیا تھا کہ جو آدمی
کسی کو بھرتی کرائے اُسے پیسے دیئے جاتے تھے۔ بہت سے لوگوں نے اسے ذریعہ معاش
بنا لیا تھا۔ وہ شہروں میں گھومتے رہتے یا دیہات میں نکل جاتے جہاں کوئی نوجوان نظر آتا
اسے سبز باغ دکھا کر ڈاک بنگلے میں لے جاتے۔ وہاں بھرتی والے موجود ہوتے تھے۔ وہ
رسمی سی کارروائی کر کے بھرتی کرتے اور وہیں سے ٹریننگ سنٹروں میں بھیج دیتے۔
ایک ایک آدمی ایک ایک دن میں دس دس نوجوان بھرتی کرا کے خاصے پیسے کما لیتا
تھا.....

"اس آدمی نے مجھے بھرتی کی پیشکش کی تو میں فوراً رضامند ہو گیا۔ اُس نے مجھ سے
گھر کا اتا پتا پوچھا تو میں نے جواب دیا۔ "میں دراصل فوج میں بھرتی ہونے کے لئے ہی
گھر سے بھاگا ہوں۔ اگر میں نے گھر کا پتہ بتا دیا تو مشکل بن جائے گی"۔ اس آدمی کو قربانی
کے ایک بکرے کی ضرورت تھی۔ اس نے کہا کہ بھرتی کے بعد پولیس سے تصدیق کرائی جاتی
ہے کہ رنگروٹ کا چال چلن اچھا ہے اور یہ جرائم پیشہ نہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں اپنے گھر کا پتہ
دے دوں گا اور ظاہر کروں گا کہ یہ میرا بھانجا ہے۔ اُسے اپنی کمشن سے غرض تھی۔ وہ مجھے ساتھ
لے گیا۔ ڈاک بنگلے میں بھرتی ہونے والوں کا ہجوم تھا۔ مجھے دس جماعت پاس ہونے کی وجہ
سے الگ کھڑا کیا گیا۔ بھرتی کرنے والے عملے نے مجھے ٹھوک بجا کر دیکھا اور سپلائی کور میں کلرکی
میں بھرتی کر لیا۔ دو روز بعد مجھے چک لالہ (راولپنڈی) بھیج دیا گیا۔ میں محفوظ ہو گیا۔ جنگِ عظیم
میں خاکی وردی والوں کی بہت قدر کی جاتی تھی۔ تین مہینے کی ٹریننگ کے بعد مجھے کلکتہ بھیج
دیا گیا۔ اُن دنوں برما میں زبردست جنگ ہو رہی تھی۔ فوجی برما کے متعلق بڑی ڈراؤنی
باتیں سناتے تھے۔ جاپانیوں کے متعلق تو فوجی یہاں تک بتاتے تھے کہ وہ جس ہندوستانی سپاہی
کو قیدی بنا لیتے ہیں، اس کی آنکھیں نکال لیتے ہیں یا اسے سامنے کھڑا کر کے اُس پر بیونٹ (سنگین)
مارنے کی مشق کرتے ہیں۔ یہ دہشت ناک قصے سن سن کر میرا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ میں مرنے کیلئے
تیار نہیں تھا۔ میں جاپانیوں کا قیدی بھی نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن میں حکم کا پابند تھا۔ اگر حکم
نہ مانتا تو چودہ سال کے لئے انگریز جیل خانے میں بند کر دیتے.....

"ایک مہینہ کلکتے میں گزرا۔ اس عرصے میں بیوی کی لاش میری نظروں کے سامنے رہی۔
بعض اوقات یہ لاش اس طرح سامنے آجاتی جیسے یہ حقیقی ہے اور میں اسے چھو سکوں گا۔
رات کو ڈر کر جاگ اٹھنا تو معمول بن گیا تھا۔ ایسے بھی ہوا کہ رات کو میں ویران علاقے میں چلا
گیا تو مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے پیچھے دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔
اس طرح بیوی میرے دل اور دماغ پر سوار رہی۔ مجھ پر خاموشی چھائی رہتی تھی۔ پھر مجھے فرنٹ
پر بھیج دیا گیا۔ بزدلی کا یہ عالم تھا کہ رات کو میں سوتا نہیں تھا۔ ڈر یہ تھا کہ جاپانیوں کے ہوائی جہاز بم
پھینک کر مار ڈالیں گے۔ اگلے مورچوں تک سپلائی پہنچانے کے لئے بھی جانا پڑتا تھا تو توپوں
کی گولا باری سے دل دہل جاتا تھا۔ ہوائی جہازوں کے حملے خون خشک کر دیتے تھے۔ موت ہر
وقت دماغ میں سمائی رہتی تھی۔ میرے ساتھی ہنستے کھیلتے تھے اور میں بچوں کی طرح خوفزدہ
رہتا تھا۔ وہاں میرے ساتھیوں نے مجھے مذاق اور پھبتیوں کا نشانہ بنا لیا۔ دو تین مخلص
ساتھیوں نے مجھے دل مضبوط کرنے کو کہا۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ دل مضبوط کس طرح کیا
جاتا ہے۔ میں ڈرتا ہی رہا.....

"انگریزوں نے جوابی حملہ کیا تو جاپانی فوج پسپا ہونے لگی لیکن جنگ بہت ہی خونریز اور
خوفناک تھی۔ ایک سال بعد مجھے یونٹ کے ساتھ پھر کلکتہ بھیج دیا گیا۔ تین ماہ بعد ایک بار پھر آگے
بھیجا گیا مگر اب جنگ کی شدت ختم ہو چکی تھی۔ برما پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ پھر بھی میں خوفزدہ
رہتا تھا۔ ایک سال بعد ہماری یونٹ کو رانچی بھیج دیا گیا۔ رانچی بھارت کا ایک مشہور شہر ہے جو
بلندی پر واقع ہے۔ فرنٹ سے جن یونٹوں کو آرام کے لئے پیچھے بھیجا ہوتا تھا انہیں رانچی بھیج
دیا جاتا تھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو شہر سے چھ سات میل دور جنگلوں میں بے شمار فوج پڑی
تھی۔ دو ہوائی اڈے بھی تھے۔ وہاں سوائے آرام کے فوج کا کوئی کام نہیں تھا۔ انگریزوں
نے وہاں کچی بارکیں بنا دی تھیں اور بعض یونٹیں خیموں میں رہتی تھیں۔ میری یونٹ کا کیمپ
شہر سے آٹھ میل دور تھا۔ وہاں دھان کی کھیتیاں اور جنگل تھا۔ تھوڑی دور ایک گاؤں تھا۔
وہاں چونکہ ہمارا کوئی کام نہیں تھا، اس لئے ہم سیر سپاٹے کے لئے نکل جاتے تھے۔ میرے
ساتھی دو دو چار چار کی ٹولیوں میں گھومتے پھرتے تھے۔ میں زیادہ تر اکیلا ہی رہتا تھا۔

شام کو میں گاؤں کی طرف نکل جایا کرتا تھا۔ وہ علاقہ خوب صورت تھا۔ ایک ندی بھی بہتی تھی۔۔۔۔۔

"ایک شام میں روزمرّہ کی طرح اکیلا ندی کے کنارے بیٹھا تھا کہ ایک اُدھیڑ عمر دیہاتی میرے پاس آبیٹھا۔ وہ کسان تھا اور مسلمان۔ اس کے پوچھنے پر جب میں نے اُسے بتایا کہ میں مسلمان ہوں تو تپاک سے اس نے ہاتھ ملایا۔ کہنے لگا ۔۔۔ "میں تمہیں ہر روز اکیلے پھرتے دیکھتا ہوں۔ فوجی ٹولیوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ وہ ہماری لڑکیوں کو چھیڑتے ہیں۔ گاؤں میں ہندو دیسی شراب کشید کرتے ہیں۔ فوجی یہ شراب پیتے ہیں۔ تم سب سے الگ تھلگ کیوں رہتے ہو؟" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا ۔۔۔ "کیونکہ میں مسلمان ہوں" ۔۔۔ وہ میری شرافت سے متاثر ہوا لیکن میں نے اُسے یہ نہیں بتایا کہ وہ جسے شرافت سمجھ رہا ہے وہ دراصل بزدلی ہے۔ میری عمر چوبیس پچیس سال تھی اور میں فوجی تھا۔ فوجی بھی میں ایسی فوج کا تھا جس میں شرافت کا نام و نشان نہ تھا۔ میرے ساتھی شراب پیتے تھے۔ بازاری عورتوں کے پاس جاتے تھے۔ راشن چوری کر کے بیچتے تھے۔ دیہات کی غریب عورتوں کو تھوڑا سا راشن دے کر اُن کی عزّت سے دل بہلاتے تھے۔ میں اکیلا گھومنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرتا تھا کیونکہ میں بزدل تھا۔ میں مفرور قاتل تھا۔ بہرحال یہ ادھیڑ عمر دیہاتی مسلمان میرے ساتھ بے تکلف ہو گیا۔ اس علاقے میں دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک تو ہندو دیہاتی تھے جن کے رنگ اور چہرے کے نقش آسٹریلیا کے حبشیوں کی طرح تھے۔ ان میں ایسے بھی تھے جن کا کوئی مذہب نہیں تھا۔ انہی میں مسلمان بھی تھے جن کے نقش و نگار ہماری طرح اور رنگ گندمی تھے۔ مسلمان صاف ستھری عادات اور زبان کی شائستگی سے فوراً پہچانے جاتے تھے۔ اُن کا رہن سہن بھی صاف ستھرا تھا۔۔۔

"پہلے روز یہ اُدھیڑ عمر کسان جس کا نام کریم تھا ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ مجھے یہ آدمی اچھا لگا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ اگلی شام وہ پھر مجھے اُسی جگہ ملا اور مجھ سے میرے والدین وغیرہ کے متعلق پوچھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ

میں اکیلا ہوں۔ کوئی عزیز زندہ نہیں۔ اُس نے بڑی پیاری پیاری باتیں شروع کر دیں۔ میں عام طور پر چپ چاپ رہتا تھا۔ اُس کی ہمدردانہ باتوں کا یہ اثر ہوا کہ میں بھی باتیں کرنے لگا۔ میری اور اُس کی عمر میں بیس پچیس سال کا فرق تھا۔ لیکن میں اسے ہم عمر اور ہمجولی سمجھنے لگا۔ اس کے بعد میں روزانہ شام کے وقت وہاں چلا جاتا اور وہ میرے پاس آبیٹھتا۔ ایک روز میں اُس کے گھر والوں کے لئے جمے ہوئے دُودھ کا ایک ڈبہ، فروٹ کا ایک ڈبہ، سیر بھر چینی اور چائے کی پتی لے گیا۔ اس نے یہ چیزیں لے لیں اور کہنے لگا کہ میں اُس کے گھر چلوں۔ میں چلا گیا۔ وہ کچے مکان میں رہتا تھا۔ اس کی بیوی تھی، دو چھوٹے بیٹے اور ایک جوان لڑکی تھی جس کی عمر بیس سال سے زیادہ تھی۔ کریم نے میرا تعارف ایسے الفاظ میں کرایا جیسے میں اُس کا بہت پرانا دوست ہوں۔ اُس نے اپنی بیٹی کو چائے بنانے کے لئے کہا۔ میں نے چاقو سے دُودھ کا ڈبہ کھول دیا۔ کریم کی بیوی نے میرے ساتھ ماؤں والا سلوک کیا۔ اس کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ ان کے سلوک سے میں نے وہاں ذرہ بھر اجنبیت محسوس نہ کی۔ میں پیار اور اُنس کا بھوکا تھا۔ وہ مجھے اس گھر میں نظر آیا۔۔۔۔۔

"سب سے زیادہ کریم کی بیٹی مجھے پسند آئی۔ اس پسندیدگی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ جوان لڑکی تھی بلکہ اس میں ایسا خلوص تھا جس نے میرے دل کو اُس کا قیدی بنا دیا۔ جہاں تک شکل و صورت کا تعلق ہے وہ تو مجھے بہت ہی پسند آئی۔ اس کا رنگ کھلا ہوا گندمی تھا۔ آنکھوں میں، قد بُت میں اور چال ڈھال میں عجیب سی کشش تھی۔ اس گھر سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا، لیکن مجھے کیمپ میں پہنچنا تھا۔ میں کیمپ میں چلا گیا۔ اُس رات بہت دیر بعد میری آنکھ لگی۔ یہ لڑکی اور اس کا کنبہ میرے ذہن پر غالب رہا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ کریم کے گھر نہیں جایا کروں گا۔ وجہ یہ تھی کہ فوجی راشن دے کر دیہاتنیوں سے راہ و رسم پیدا کرتے اور ان کی لڑکیوں کو خراب کرتے تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کریم اور اُس کی بیٹی بدنام ہو جائے۔ میں نے بھی وہی حرکت شروع کر دی تھی جو دوسرے فوجی کرتے تھے۔ میں انہی کی طرح راشن لے کے جاتا تھا۔ ان کے

گھر میں بٹھیاتا تھا تو کسی کو معلوم نہ تھا کہ میں کریم کی بیٹی کو بری نظر سے نہیں دیکھتا۔ لوگ یہ دیکھ رہے تھے کہ میں فوجی ہوں اور اس گھر میں جاتا ہوں جہاں ایک جوان لڑکی ہے......

"میں نے بہت کوشش کی کہ کریم کے گھر نہ جاؤں لیکن دوپہر کے بعد میں کھچا ہُوا چلا جاتا اور اتوار کا سارا دن اس کے گھر گزارتا۔ میں سپلائی کا کلرک تھا۔ ہندوستانی اور گورا فوج کا راشن ہمارے پاس تھا۔ میں دوسرے تیسرے دن راشن کی کچھ چیزیں کریم کے گھر لے جاتا۔ اس نے مجھے اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ میری نیت میں اسے کوئی فتور نظر نہیں آیا تھا۔ اُس نے ایک روز مجھے کہا کہ میں اس کے گھر خالی ہاتھ آیا کروں۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں ان کے کنبے کے خلوص اور پیار کی قیمت نہیں دے سکتا۔ بہرحال یہ سلسلہ چلتا رہا اور میں ان کے گھر کا فرد بن گیا۔ ایک مہینے بعد کریم کی بیٹی کے ساتھ بھی بے تکلفی پیدا ہو گئی جو ہر لحاظ سے شرافت کی حدود میں تھی۔ دوسرے مہینے کے دوران کریم کی بیوی نے مجھ سے پہلی بار پوچھا کہ میں شادی شدہ ہوں یا نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ ابھی شادی نہیں کی اور نہ کوئی اپنا زندہ ہے۔ جو میرے لئے شادی کا اہتمام کرے گا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ یہ یقیناً وہی سوچ تھی جس میں میں پڑا ہُوا تھا۔ میں سوچ چکا تھا کہ کریم سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگ لوں اور اس کا گھر جوائی بن جاؤں، مگر مجھ میں ایسی بات کہنے کے لئے جرأت نہیں تھی......

"تیسرے مہینے میں نے کریم سے پوچھا ––– عائشہ کا رشتہ کہیں دے رکھا ہے؟ ––– لڑکی کا نام عائشہ تھا۔ کریم نے جواب دیا کہ دو جگہ سے پیغام آئے ہیں لیکن اسے دونوں جگہیں پسند نہیں۔ میں بزدل آدمی تھا۔ دل کی بات نہ کہہ سکا۔ دس بارہ دنوں بعد کریم نے عائشہ کے رشتے کی خود ہی بات چھیڑ دی اور اپنی عادت کے مطابق اتنی بے تکلفی سے بات کی کہ میں نے جھجکتے جھینپتے اسے کہہ ہی دیا کہ وہ مجھے قبول کر لیں۔ کریم نے جواب دیا کہ وہ میرے متعلق سوچ چکا ہے لیکن اس وجہ سے چپ رہا کہ میں پنجاب کا رہنے والا ہوں

اس کی بیٹی بہت دور چلی جائے گی۔ میں نے اُسے کہا کہ میرا تو کوئی گھر گھاٹ نہیں۔ صرف ایک مکان تھا، وہ کبھی کا فروخت کر چکا ہوں۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں شادی کر کے اسی کے گھر کو اپنا گھر بنانا چاہتا ہوں۔ وہ راضی ہو گیا۔ میں دوسرے دن اُس کے گھر گیا تو عائشہ مجھ سے چھپ گئی۔ میں سمجھ گیا کہ گھر میں کریم نے بات کر دی ہے اور میرے حق میں فیصلہ ہو چکا ہے۔ کریم اور اُس کی بیوی نے مجھے اس فیصلے سے آگاہ کیا۔ مجھے اس کی خوشی بھی ہوئی لیکن اُس رات کیمپ میں جب بتیاں بجھ گئیں تو میرے آنسو نکل آئے۔ میں بے قابو ہو گیا اور بچوں کی طرح رونے لگا۔ پچھلی ساری زندگی آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ ماں باپ یاد آئے۔ بہن تو بہت ہی یاد آئی اور میں سوچ سوچ کر روتا ہی رہا کہ ہم دونوں زندہ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لئے مر گئے ہیں۔ مجھے وہ وقت یاد آ رہا تھا جب میری پہلی شادی ہوئی تھی تو میری بہن خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ آدھی رات تک میں روتا رہا اور روتے روتے آنکھ لگ گئی.....

"ہمارا کمانڈنگ آفیسر انگریز تھا۔ میں نے اپنے حوالدار میجر سے بات کی۔ اُس نے صوبیدار کو بتایا۔ صوبیدار ایک سکھ تھا۔ بہت ہی اچھا آدمی تھا۔ اس نے مجھے کمانڈنگ آفیسر کے پیش کیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ یہ ایک شریف گھرانہ ہے۔ ان کی لڑکی بھی شریف ہے۔ مجھے شادی کی اجازت دی جائے۔ میری درخواست کمانڈنگ آفیسر کے لئے عجیب چیز نہیں تھی۔ کئی فوجیوں نے بنگالی اور برمی لڑکیوں کے ساتھ شادیاں کی تھیں۔ کمانڈنگ آفیسر نے یہ شرط عائد کر کے شادی کی اجازت دے دی کہ میں اپنی بیوی کے ساتھ نہیں رہ سکوں گا۔ مجھے صرف تین دن کی چھٹی ملے گی۔ اس کے بعد میں کیمپ میں رہوں گا اور جب یونٹ یہاں کسی چھاؤنی میں چلی جائے گی تو میں اپنی بیوی کو ساتھ نہیں لے جا سکوں گا۔ بیوی کو صرف اس صورت میں ساتھ رکھوں گا جب چھاؤنی میں مجھے سرکاری کوارٹر مل جائے گا..... اس سے چند دن پہلے جاپان ہتھیار ڈال چکا تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ ہمارے لئے اب امن ہی امن تھا....

"دن مقرر کر کے میں نے اس کے مطابق تین دن کی چھٹی لے لی۔ میرے پاس
پرائیویٹ کپڑوں کا وہی جوڑا تھا جس میں میں بیوی کو قتل کر کے فرار ہوا تھا۔ البتہ وردی
کے تین جوڑے تھے۔ میں نے پرائیویٹ پتلون اور قمیض پہنی اور میری شادی ہو گئی۔
گاؤں میں مسلمانوں کے چند ایک گھرانے تھے۔ ان کی عورتوں اور لڑکیوں نے رونق پیدا
کر دی تھی۔ میرے ساتھ کوئی باراتی نہیں تھا۔ شام کے وقت جب میں اس کنبے میں اکیلا
رہ گیا تو اپنے تھیلے میں سے نوٹوں کا وہ بنڈل نکالا، جو میں اپنے ساتھ چھپائے چھپائے
پھرتا تھا۔ یہ میری اڑھائی سال کی تنخواہ تھی۔ جنگ میں جانے والے فوجی اپنے گھروں
کے ایڈریس دے دیتے تھے۔ ان کی تنخواہیں ان کے گھروں میں ہر ماہ پہنچ جاتی تھیں۔
فرنٹ پر پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ فوجیوں کے پیسے سرکاری طور پر ان کے
گھروں کو چلے جاتے تھے۔ میرا کوئی گھر نہیں تھا۔ کوئی عزیز نہیں تھا۔ میں ساری تنخواہ
لے کر پاس رکھ لیتا تھا۔ ہم کلکتے جیسے بڑے شہر میں بھی رہے لیکن میں نے کوئی عیاشی
نہیں کی۔ میں تقریباً ساری تنخواہ بچا لیتا تھا۔ میں نے اڑھائی سال کی تنخواہ کریم کے حوالے
کر دی۔ وہ ایسا شریف آدمی ثابت ہوا کہ اس نے نوٹوں کا یہ بنڈل اپنی بیٹی کے ہاتھ
میں دے کر کہا — "یہ تمہاری دولت ہے۔ میں نے بیٹی خدا کے نام پر دی ہے۔ بیچی
نہیں"

میری دلہن نے یہ رقم اپنے ٹرنک میں رکھ لی ....

"یہاں سے میری زندگی ایسے تلخ دور میں داخل ہو گئی کہ آج بھی یاد کرتا ہوں تو
جسم کانپ اٹھتا ہے۔ میں جب سے اس گھر میں جانے لگا تھا میری ذہنی حالت سنبھل
گئی تھی۔ پہلی بیوی کی دہشت ناک یاد کا وہ حال نہیں رہا تھا جو پہلے تھا اور جب مجھے عائشہ
اچھی لگی تھی تو پہلی بیوی ذہن سے نکل گئی تھی۔ میں شاید پیار اور پناہ کا بھوکا تھا۔ مجھے دونوں
چیزیں مل گئی تھیں۔ عائشہ کے ساتھ شادی کر کے تلخیاں اور محرومیاں ختم ہو گئی تھیں۔ میں
نیا انسان بن گیا۔ مجھے روحانی سکون حاصل ہوا تھا مگر رات کے وقت جب میں عائشہ
کے سامنے پہلی بار دولہا کے روپ میں گیا تو مجھے پتہ چلا کہ میرا روحانی سکون تو اب تباہ
ہوا ہے اور میں نے یہ خطرہ بھی محسوس کیا کہ اب میں بیوی کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو قتل

کر دوں گا .... کریم کے کچے مکان کے دو کمرے تھے۔ چھوٹا کمرہ ہمیں دے دیا گیا تھا۔ میں جب
اس کمرے میں داخل ہوا تو وہاں لالٹین جل رہی تھی۔ عائشہ چارپائی پر دلہن بنی بیٹھی تھی۔ آپ
اس خوشی کو تصور میں نہیں لا سکتے جس نے مجھے عائشہ کو دیکھ کر پاگل بنا ڈالا تھا۔ میں نے آگے
بڑھ کر اس کا گھونگھٹ اٹھا دیا اور کہا — "ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی تو نہیں" —
وہ شرمائی بھی اور ہنس بھی پڑی۔ اس کی یہ عادت مجھے بہت پسند تھی کہ بات بے تکلفی سے
کھل کر کیا کرتی تھی۔ جھجکتی اور شرماتی نہیں تھی اور اس میں دلیری تھی جیسے پنجاب کی دیہاتی
لڑکیوں میں ہوتی ہے۔ میں نے اس کا گھونگھٹ پیچھے ہٹا دیا تو وہ ہنس پڑی اور بولی —
"میں نے گھونگھٹ اس لئے لٹکا لیا تھا کہ آپ یہ نہ کہیں کہ کیسی بے حیا لڑکی ہے" ....

"اس نے کہا — "سہیلیوں نے تین راتوں سے سونے نہیں دیا۔ مجھے تو نیند آ رہی
ہے" — وہ پھر ہنس پڑی اور لیٹ گئی۔ میں اس کے پاس چارپائی پر بیٹھا تھا۔ وہ جب
لیٹی تو میری نظر اس کے چہرے پر پڑی۔ یہ وہی چہرہ تھا جس کا حسن میرے دل میں اتر گیا تھا
مگر اب یہ چہرہ دیکھا تو میرے اندر بڑی زور کا دھماکہ ہوا اور عائشہ کا چہرہ میری پہلی
بیوی کا چہرہ بن گیا۔ آنکھیں باہر نکلی ہوئیں، زبان باہر لٹکی ہوئی اور دانتوں میں جکڑی
ہوئی۔ اس وقت عائشہ کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے بڑی تیزی سے اس کا
ہاتھ چھوڑ دیا اور بدک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے چکر آیا اور پھر چارپائی پر
بیٹھ گیا۔ عائشہ گھبرا کر اٹھی۔ میں نے سر جھکا کر ہاتھوں پر رکھ لیا تھا۔ اس نے میرا سر اٹھایا
اور پوچھا کہ کیا ہوا ہے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور پھر ڈوبنے لگا۔ عائشہ گھبرا گئی
تھی اور بار بار پوچھتی تھی کہ بیٹھے بیٹھے مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں نے اس کے چہرے کو ایک
بار پھر دیکھا جو اب میرے چہرے کے بالکل قریب تھا۔ یہ عائشہ کا چہرہ تھا جو مجھے بہت
اچھا لگتا تھا مگر میں اس کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا تھا۔ میں عائشہ کو نہیں بتا سکتا تھا کہ
مجھے کیا ہوا ہے۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دیا۔ عائشہ بہت پریشان ہوئی۔ میں نے وہ
رات اسی کمرے میں گزاری۔ ہم نے لالٹین بجھا دی تھی۔ کبھی تو میری آنکھ لگ جاتی اور کبھی

میں سخت گھبراہٹ کی حالت میں جاگ اٹھتا اور اس حالت میں مجھے دو چار سیکنڈ کے لئے یوں معلوم ہوتا جیسے یہ لڑکی جو میرے بستر پر سوئی ہوئی ہے میری پہلی بیوی ہے۔ میں اس کے جسم کو ہاتھ لگانے سے ڈرتا تھا.....

"سب سے بڑا خوف جو میرے دل پر طاری ہو گیا وہ یہ تھا کہ عائشہ بھی مجھ سے اسی طرح نفرت کرنے لگے گی جس طرح پہلی بیوی کرتی تھی۔ یہ میری بزدلی تھی۔ پہلی بیوی چڑیل کی طرح میرے اندر داخل ہو گئی تھی۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اپنے آپ سے یہ کہتا کہ ہاں وہ بدکار تھی، مجھے دھوکا دے رہی تھی اس لئے میں نے اُسے قتل کر دیا ہے لیکن خوف میرے اندر سے نکلا نہیں تھا صبح بھی عائشہ پریشان نظر آئی مجھے افسوس ہُوا کہ اس کنواری لڑکی کی شبِ عروسی کو میں نے ماتم کی رات بنا دیا ہے۔ اُس نے مجھ سے طبیعت کے متعلق کئی بار پوچھا۔ مَیں نے اسے یقین دلایا کہ میں ٹھیک ہوں۔ مَیں جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ دن کی روشنی میں تو میں بالکل ٹھیک تھا...... میں باہر نکل گیا اور ندی کے کنارے جا بیٹھا۔ بہت خوب صورت علاقہ تھا۔ رانچی میں بارش بہت زیادہ ہوتی تھی۔ ہر طرف سبزہ تھا۔ میں تنہائی میں بیٹھ کر اپنے آپ میں دلیری پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ عائشہ بہت پیاری لڑکی تھی۔ میں اس کا تصوّر ذہن میں بٹھانے لگا اور پہلی بیوی کو ذہن سے نکالنے کے لئے اپنے آپ سے کہتا رہا کہ وہ کُتیا تھی۔ طوائف تھی۔ اسے قتل کر کے میں نے نیکی کی ہے۔ اب اس کا تصوّر مجھے نہیں ڈرائے گا....

"ازدواجی زندگی کی دوسری رات آگئی۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی لالٹین بجھا دی تاکہ عائشہ کی صورت نہ دیکھ سکوں مگر اُس کے جسم کو اندھیرے میں ہاتھ لگایا تو اندھیرے میں پہلی بیوی کا چہرہ مجھے کمرے میں اس طرح نظر آیا کہ پتنگ کی طرح ہوا میں جھوم رہا تھا۔ میرے منہ سے نکل گیا ——— 'یا خدا، مجھے بخش دے'۔ مجھے یاد نہیں کہ میں بدک کر اُٹھ کھڑا ہُوا تھا یا میں نے کیا کیا تھا، عائشہ زور سے اُٹھی اور دوڑ کر لالٹین جلا دی۔ میرا سارا جسم پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ حالانکہ رات ٹھنڈی

تھی اور مینہ برس رہا تھا۔ عائشہ نے بتایا کہ میرا رنگ لاش کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ میری آنکھوں کے ڈھیلے باہر آ رہے تھے۔ مَیں کانپ رہا تھا اور میری نظریں کمرے میں بھٹک رہی تھیں۔ عائشہ ذہین لڑکی تھی اور وہ صبر والی بھی تھی۔ میری پہلی بیوی کی طرح اس میں یہ تکبّر نہیں تھا کہ امیر باپ کی بیٹی ہے اور نہ اُسے اپنی خوبصورتی پر بے جا ناز تھا۔ وہ سیدھی سادھی دیہاتی تھی اور ایسے علاقے کی رہنے والی تھی جہاں پنجابی مرد کو بہت ہی طاقتور اور دلیر سمجھا جاتا تھا۔ مگر میرے جسم میں عائشہ کے لئے طاقت کا ایک ذرّہ بھی نہیں تھا اور دلیری کا مجھ میں نام و نشان نہ تھا۔ دوسری رات بھی میری حالت پہلی رات والی ہو گئی تو اُس نے کہا کہ میں اپنا علاج کراؤں۔ میں نے اُسے تسلی دی اور کہا کہ میں ٹھیک ہوں۔ شاید جنگ میں توپوں کے دھماکوں کا اور لاشیں جو دیکھی ہیں ان کا اثر ہے کہ یہ حالت ہو جاتی ہے۔ پھر بھی اس نے کسی سیانے سے ملنے کا مشورہ دیا.....

"تیسری رات بھی ایسا ہی ہُوا۔ عائشہ میرے ساتھ اس طرح جذباتی ہو کر لپٹ گئی جس طرح ماں اپنے بیمار بچے کو بازوؤں اور گود کی پناہ میں لے لیتی ہے۔ اس نے یہ شک بھی ظاہر کیا کہ مجھ پر جن بھوت یا آسیب کا اثر ہے۔ اُس نے کہا کہ وہ اپنی ماں کو بتائے گی اور وہ ایک پیر سے تعویذ لا دے گی۔ میں نے اسے منع کر دیا اور یہ بھی کہا کہ وہ اپنی ماں سے ذکر نہ کرے صبح ہوئی تو میری تین دن کی چھٹی ختم ہو چکی تھی۔ میں کیمپ میں چلا گیا۔ میرے ساتھیوں نے مجھ سے مذاق بھی کئے۔ بعض نے اس شک کا اظہار بھی کیا کہ میں نے شادی نہیں کی، دوسروں کی طرح کسی طوائف کے پاس چھٹی گزار آیا ہوں۔ میں خاموش تھا۔ میں بُری طرح ناکام ہو کر آیا تھا۔ حوالدار میجر مسلمان تھا اور اچھا آدمی تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ رات کو کیمپ سے نکل جایا کرو۔ رات بیوی کے ساتھ گزار کر صبح طلوع ہونے سے پہلے آ جایا کرو۔ یہ خطرہ اس نے اپنی ذمہ داری پر مول لیا تھا۔ میں نے یہ معمول بنا لیا کہ رات کو میں اپنی بیوی کے پاس چلا جاتا اور صبح ابھی تاریک ہوتی تو کیمپ میں واپس آ جاتا۔ ہر رات عائشہ کے جسم کو ہاتھ لگاتے ہی کبھی تو یوں ہوتا کہ اندھیرے میں

مجھے اپنی پہلی بیوی کی لاش کا مکروہ چہرہ نظر آتا یا مجھے یقین کی حد تک محسوس ہوتا کہ یہ عائشہ نہیں میری پہلی بیوی کی لاش پڑی ہے۔ میں بدک کر عائشہ سے دور ہٹ جاتا اور عائشہ پریشان ہو کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیتی اور کبھی کبھی وہ رو بھی پڑتی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس کیلئے مرد نہیں بلکہ برف کا بلاک تھا.....

"اگر میں ایک ایک رات کا حال سنانے لگوں تو آپ اکتا جائیں گے۔ آپ مختصراً یہ سن لیں کہ دس بارہ دنوں بعد میری ذہنی حالت تو سنبھل گئی، مجھے اب اپنی پہلی بیوی نظر نہیں آتی تھی لیکن عائشہ کے لئے میں لاش بن گیا۔ دن کے وقت میں اسے چلتا پھرتا نظر آتا تھا لیکن وہ جب تنہائی میں میرے پاس ہوتی تھی تو میں لاش ہوتا تھا۔ جسم بیکار اور فالج زدہ ہو جاتا تھا۔ میرے اندر اتنی تلخی پیدا ہو گئی کہ میں یہ سوچنے لگا کہ بھاگ جاؤں اور فوج سے بھی بھگوڑا ہو کر ایک اور فرار اختیار کر دوں، لیکن عائشہ کا سلوک ایسا تھا کہ اس نے مجھے زنجیروں میں جکڑ لیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ میری زرخرید لونڈی ہے اور میری خدمت کے لئے زندہ ہے۔ اگر میں کہوں کہ وہ میری عبادت کرتی تھی تو غلط نہیں ہوگا۔ یہی رویہ اس کے باپ کا اور اس کی ماں کا تھا۔ میں یہ سمجھ چکا تھا کہ میں بزدل ہوں اور پہلی بیوی آسیب کی طرح مجھ پر قابض ہے۔ میں یہ تسلیم کرنے سے گھبراتا تھا کہ میں نے اسے قتل کیا ہے..... دن گزرتے جا رہے تھے۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ راتیں گزرتی جا رہی تھیں اور عائشہ میرے اندر اس مرد کو جگانے کی کوشش کر رہی تھی جو خاوند کہلاتا ہے اور جو اپنی بیوی کا فخر ہوتا ہے....

"ایک رات وہ رو پڑی اور کہنے لگی — "میں آپ کی پسند کی لڑکی نہیں ہوں۔ میں ایک غریب دیہاتن ہوں۔ آپ کسی شہری لڑکی کے ساتھ شادی کر لیتے" — میں نے اسے روک دیا اور یقین دلایا کہ میں اسے دل و جان سے چاہتا ہوں۔ پھر ایک رات میں اس قدر پریشان ہوا کہ میں نے عائشہ سے پوچھا "تمہارے دل میں میری محبت ہے یا تم صرف بیوی ہو؟" — اس نے جواب دیا — "اگر آپ مجھے دھتکار دیں گے تو بھی آپ کے قدموں میں بیٹھی رہوں گی، اور آپ کے لئے جان قربان کر دوں گی" — میں سمجھتا تھا

کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے وہ اس کے دل کی آواز ہے۔ اس میں تعلیم یافتہ شہری لڑکیوں والی بناوٹ نہیں تھی۔ میں نے اسے کہا — "اگر یہ بات ہے تو اپنی محبت کا ثبوت دو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم ثابت قدم رہتی ہو یا نہیں۔ سنو عائشہ! تم ٹھیک کہتی ہو کہ مجھ پر کوئی آسیب سوار ہے۔ یہ آسیب وہ نہیں ہے جو تم سمجھتی ہو۔ یہ میری پہلی بیوی ہے جسے میں نے قتل کر دیا تھا" اس نے چونک کر نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ میں نے اسے پہلی بیوی کے متعلق پوری تفصیل سے بتا دیا کہ وہ کیا کرتی تھی میرے ساتھ اس کا سلوک کیسا تھا اور میں نے اسے کس طرح قتل کیا تھا۔ میں نے کہا۔ "مجھے اس سے نفرت تھی اور مجھے دلی محبت تم سے ہے۔ میں مفرور قاتل ہوں اور میں بزدل ہوں۔ اتنا ڈرپوک ہوں کہ کسی کے سامنے اونچی بات بھی نہیں کر سکتا۔ اسی کا اثر ہے کہ رات کو تم میرے پاس ہوتی ہو تو یہ وہم میرے جسم کی ساری طاقت چوس لیتا ہے کہ یہ جسم تمہارا نہیں بلکہ اس بیوی کا ہے جسے میں نے قتل کر دیا تھا۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ اپنی ماں کو اور اپنے باپ کو بتا دو کہ یہ شخص مفرور قاتل ہے اور یہ ہمارے سامنے جھوٹ بولتا رہا ہے......

"اس نے کہا — "میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ مجھے صرف یہ بتا دیں کہ آپ کے دل میں میری سچی محبت ہے؟" — میں نے اسے ایسے لفظوں میں یقین دلایا کہ وہ مان گئی۔ اس نے پھر تعویذ کی بات کی اور یہ بھی کہا کہ وہ نماز پڑھا کرے گی اور دعا کیا کرے گی کہ خدا مجھے اس آسیب سے نجات دلائے۔ میں نے اسے کہا کہ تعویذ میری کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ نماز ضرور پڑھو اور میری بخشش کی دعا مانگو۔ اس نے پھیکی سی ہنسی ہنس کر کہا — "میں نے سنا تھا کہ پنجابی بڑے سخت ہوتے ہیں۔ غیرت میں آ جائیں تو قتل کر دیتے ہیں۔ میں ایسا ہی خاوند چاہتی تھی جو غیرت والا ہو" — میں اسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ مجھ میں غیرت تو ہے، دلیری نہیں ہے۔ قتل کا راز اگل کر مجھے عجیب سا سکون محسوس ہوا لیکن میری جسمانی حالت پہلے کی طرح برف کی مانند سرد رہی۔ اس رات کے بعد عائشہ نے میرے قدموں میں بیٹھنا شروع کر دیا۔ ایک رات میں نے اسے کہا — "دیکھو عائشہ، تم میری غلام نہ بنو۔

مجھے اپنا غلام بناؤ۔ مجھے غلام بننے میں لطف آتا ہے مجھ پر حکم چلایا کرو۔۔۔ لیکن عائشہ ایسی لڑکی نہیں تھی۔ اُس نے میری بات کو مذاق سمجھ کر ٹال دیا اور میری غلام بنی رہی مگر میرے جسم میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ میں جب عائشہ کے قریب ہوتا تو میری رگوں میں خون جم جاتا۔ عائشہ نے بہت کوشش کی کہ میرے خون کو گرما سکے مگر پہلی بیوی کا آسیب اتر نہ سکا....

"عائشہ نے اپنے والدین کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ ان کے سامنے وہ خوش رہتی تھی۔ ایک وہ بیوی تھی جس نے مجھ سے نفرت کر کے مجھے پریشان کر دیا تھا اور ایک یہ بیوی تھی جس کی محبت نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں ہر رات یہ خطرہ مول لیتا تھا کہ رات کو کیمپ سے کھسک جاتا اور بیوی کے پاس چلا جاتا تھا۔ میں کسی بھی رات پکڑا جاتا تو مجھے سزا ملتی، لیکن رات عائشہ سے دُور گزارنا میرے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔ ایک رات میں نے اُسے یہ بھی کہہ دیا۔۔۔۔۔

"میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ مجھ سے طلاق لے لو۔ میں نے تمہیں جو رقم دی ہے وہ رکھ لو اور آدھی تنخواہ ہر ماہ تمہیں ملتی رہے گی۔ میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤں گا کہ میں ساری عمر شادی نہیں کروں گا۔۔۔ وہ رو پڑی اور اُس نے میرے پاؤں پکڑ کر کہا۔۔۔ میں ساری عمر آپ کے ساتھ گزار دوں گی۔ میں نے آپ کے ساتھ جو محبت کی ہے اس کا تعلق آپ کے جسم سے نہیں۔۔۔ اس نے تو یہ کہہ دیا کہ وہ ساری عمر میرے ساتھ گزارے گی، مگر میں اُس کی ساری زندگی تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک زندہ دل اور خوب صورت لڑکی ایک ایسے آدمی کے ساتھ باندھ دی گئی تھی جو اگر پورا پاگل نہیں تو آدھا پاگل ضرور تھا.....

"سوچ سوچ کر میں اس فیصلے پر پہنچا کہ اپنے آپ کو ختم کر لوں۔ پہلی بیوی کو میں نے قتل کیا تھا کیونکہ اُسے مجھ سے نفرت تھی۔ اب میں اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں قتل کرنے پر تُل گیا کیونکہ دوسری بیوی مجھ سے محبت کرتی تھی۔ میں نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا اور اس رات میں کیمپ سے نکل گیا، لیکن عائشہ کے گھر نہیں گیا۔ ویرانے میں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ خودکشی کس طرح کروں"۔۔

"رات سرد اور اندھیری تھی۔ میں ایک درخت تلے بیٹھا تھا۔ خودکشی کا ایک طریقہ یہ سوچا کہ درخت کے کسی اونچے ٹہن کے ساتھ مضبوط رسّی باندھ کر اپنے آپ کو پھانسی دے لوں۔ دُوسرا طریقہ گاڑی کے آگے لیٹ جانے کا تھا۔ ایک طریقہ یہ بھی دماغ میں آیا کہ میں فوجی ہوں، رائفل حاصل کرنا مشکل نہیں۔ اپنے سر میں گولی مار لوں گا۔ میں نے اسی طریقے کو بہتر سمجھا اور فیصلہ کر لیا کہ کل رائفل سے خودکشی کر لوں گا۔ میں نے تصوّر میں اپنی لاش دیکھی جو میرے سامنے پڑی تھی۔ میرے آنسو نکل آئے۔ پھر اچانک یوں ہُوا کہ میری لاش پہلی بیوی کی لاش بن گئی۔ آنکھیں باہر نکلی ہوئیں، زبان دانتوں میں جکڑی ہوئی اور ہونٹوں سے لٹکتی ہوئی ۔۔۔ ایسا خوفناک چہرہ کہ میں ٹھنڈ کے باوجود سر سے پاؤں تک پسینے میں ڈوب گیا۔ زیادہ خوفزدہ تو میں اس سے ہُوا کہ لاش زمین سے اٹھی اور میری طرف آہستہ آہستہ چل پڑی۔ میں اپنے آپ کو یقین نہیں دلا سکتا تھا کہ یہ تصوّر اور واہمہ ہے اور یہ میری بزدلی کا نتیجہ ہے۔ اگر میں آگے بڑھتا تو میں لاش کو چھُو سکتا تھا۔ اسے دھکا دے کر گرا سکتا تھا لیکن اتنی جرأت کہاں سے لاتا۔ خوف سے میرا جسم کانپنے لگا اور میں جہاں بیٹھا تھا وہیں جکڑا گیا...

"میں نے بڑی زور سے قُل شریف پڑھنی شروع کر دی۔ اچانک میرے جسم میں طاقت آگئی۔ میں اُٹھا اور اندھا دُھند دوڑ پڑا۔ میرا رُخ کیمپ کی طرف تھا جو وہاں سے کم و بیش دو میل دُور تھا۔ میں اندھیرے میں دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ جگہ اونچی نیچی تھی۔ وہاں کی کھیتیاں پنجاب کی طرح ہموار اور خشک نہیں۔ ان میں دھان کے لیے پانی جمع رہتا تھا۔ بنڈ تھوڑے تنگ اور اونچے تھے جن پر آسانی سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔ بہت تیز دوڑتے ہوئے میں دھان کے کھیت میں جا پڑا۔ وہاں کیچڑ اور پانی تھا۔ ہو سکتا ہے کیچڑ نے میرے ہاتھ اور

پاؤں جکڑ لئے ہوں لیکن اٹھنے لگا تو یخ بستہ میں نے اپنی پیٹھ پر کسی کا بوجھ محسوس کیا اور پھر کسی نے میری گردن پر ہاتھ رکھ دیئے۔ میں نے ان ہاتھوں کو ہٹانے کے لئے ہاتھ مڑھاتے تو گردن پر کسی کا ہاتھ نہیں تھا۔ میں بڑی مشکل سے کیچڑ سے اُٹھا۔ پاؤں من من کے ہو گئے......

میں منڈیر پر سنبھل سنبھل کر چلنے لگا۔ بیوی کی لاش دس بارہ قدم دور میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہی ہیبت ناک چہرہ۔ میں رک گیا۔ ذرا دیر اسے دیکھتا رہا۔ خوف سے جب میری جان نکلنے لگی تو میں نے ہاتھ جوڑ دیئے اور بلند آواز سے کہا ـــــ "خدا کے لئے میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ تم مرگئی ہو۔ اب تو میری جان چھوڑ دو، یا مجھ پر رحم کرو اور میری جان لے لو۔ مجھے اس جہنم سے نجات دلاؤ۔ اب تو میں مرنا چاہتا ہوں......

لاش وہیں اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ تب میں نے سمجھا کہ یہ میری بیوی کی بدروح ہے۔ اگر مجھ سے انتقام لے لیتی تو میرے لئے اچھا ہوتا۔ میں اس ذلت سے آزاد ہو جاتا اور عائشہ مجھ جیسے بیکار اور مفلوج خاوند سے آزاد ہو جاتی...... میں نے بدروح کو پکارنا شروع کر دیا۔ اندھیرے میں ہر طرف دیکھا مگر وہ نہ آئی۔ دل کو پھر خوف نے پکڑ لیا اور میں کانپنے لگا۔ آہستہ آہستہ منڈیر پر چل پڑا۔ صاف سنائی دیتا تھا کہ بدروح میرے ارد گرد گھوم پھر رہی ہے۔ اس سے پہلے مجھے خیال نہیں آیا تھا کہ یہ بدروح ہے۔ میں نے مرے ہوئے لوگوں کی بدروحوں کے کئی قصے سنے تھے اور انہیں سچ مانا کرتا تھا۔ مجھے اب ڈر یہ لگنے لگا کہ یہ تو مرنے تک میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اس کا علاج کوئی پیر فقیر یا عامل ہی کر سکتا تھا مگر میں کسی کو یہ بتانے سے ڈرتا تھا کہ میں نے اپنی بیوی کو قتل کیا تھا۔

"میں چوری چھپے کیمپ میں داخل ہوا۔ کیچڑ سے لتھڑی ہوئی وردی اتار دی اور لیٹ گیا۔ بہت دیر بعد آنکھ لگی۔ اگلے روز اتوار تھا۔ میں عائشہ کے گھر چلا گیا۔ ان لوگوں نے رات کو نہ آنے کی وجہ پوچھی تو میں نے جھوٹ بولا کہ رات کو

میں ڈیوٹی پر تھا۔ میں بہت اداس اور پریشان تھا۔ عائشہ کا باپ کریم اور اُس کی ماں اپنی کھیتیوں کی طرف نکل گئے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے اپنی بیٹی کے پاس تنہا رہنے کے لئے کام کے بہانے باہر نکل گئے ہیں۔ عائشہ مجھے کمرے میں لے گئی۔ حال احوال پوچھا۔ میں نے اُسے تسلی دلاسہ دیا۔ اس نے پوچھا ـــ "دن کے وقت بھی آپ کو میری صورت میں پہلی بیوی نظر آئے گی؟" ـــ میں نے اسے بتایا تھا کہ یہ پہلی بیوی کی بدروح ہے......

"چھ مہینے اسی اذیت میں گزر گئے۔ ذرا تصور میں لائیں کہ وہ اذیت کیسی ہوتی ہو گی کہ عائشہ جیسی پیاری اور دلکش لڑکی جو میری بیوی نہیں میری غلام تھی، میرے پاؤں میں بچھ بچھ جاتی تھی، مگر میں اُس کے جسم کو ہاتھ لگانے سے بھی ڈرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ ایسا شعلہ بن جاتی جیسے اپنے ماں باپ کے گھر کو جلا دے گی مگر میں برف کا ایسا سخت تودہ تھا کہ پگھل نہ سکا۔ میں نے کئی بار اس کی منت سماجت کی کہ مجھ سے طلاق لے لے۔ میرا تمام پیسہ اپنے پاس رکھے اور میں اُسے ہر ماہ باقاعدہ خرچ بھیجتا رہوں گا لیکن اُس نے وہی جواب دیا جو پہلے بھی دے چکی تھی ـــ "میں نے آپ کے جسم کے ساتھ شادی نہیں کی۔ ساری عمر آپ کے ساتھ گزاروں گی" ـــ ایک رات میں نے اسے غصے سے کہا ـــ "عائشہ میں بزدل ہوں، ڈرپوک ہوں۔ میں اُس بیوی سے ابھی تک ڈرتا ہوں جو بدبخت میرے ہی ہاتھوں ماری جا چکی ہے۔ میں مرد نہیں ہوں۔ معلوم نہیں میں کیا ہوں۔ میرے اندر بدروح داخل ہو گئی ہے۔ کسی روز تمہارا بھی گلا دبا دوں گا۔ مجھ سے آزاد ہو جاؤ" ـــــ وہ بالکل نہیں ڈری۔ اُس پر کچھ اثر ہوا ہی نہیں۔ اُس نے اپنے دہکتے ہوئے گال میرے گالوں سے لگا دیئے اور کہا ـــ "میں یہی چاہتی ہوں کہ آپ میرا گلا اپنے ہاتھوں گھونٹ دیں۔ زندگی آپ کے ساتھ گزرے گی اور ہنسی خوشی گزرے گی۔ مجھے جسمانی تعلق کی کوئی پرواہ نہیں۔ آپ اسی حال میں خوش رہا کریں......

"خودکشی کا ارادہ دل سے نکل چکا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ بدروح مجھے مرنے نہیں دے گی۔ وہ مجھے اذیت دے دے کر انتقام لے رہی ہے۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ عائشہ سے فرار ہو جاؤں مگر اُس کی محبت اور اُس کا ایثار میرا راستہ روک لیتا تھا۔ وہ مجھے کسی پیر کے پاس لے جانا چاہتی تھی، لیکن میں اس ڈر سے نہیں جاتا تھا کہ قتل کا راز کھل جائے گا۔ یہ راز صرف عائشہ کو معلوم تھا۔ آخر چھٹے مہینے، میں نے عائشہ کو بتا دیا کہ مجھ پر پہلی بیوی کی بدروح کا قبضہ ہے اور یہ محض وہم اور خوف نہیں۔ میں نے پہلی بار اُس کے بھولے بھالے چہرے پر ڈر کا تاثر دیکھا اور وہ سوچ میں غرق ہو گئی۔ اُس نے کہا۔ 'مجھے پہلے ہی ڈر تھا کہ یہ کوئی آسیب ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ تعویذ وغیرہ سے اس لئے ڈرتے ہیں کہ آپ کو بتانا پڑے گا کہ آپ نے اپنی پہلی بیوی کو قتل کیا تھا۔ میں ابّا جان سے بات کروں گی مگر انہیں اصل بات نہیں بتاؤں گی۔ کہوں گی کہ بیوی مر گئی تھی اور اسکی بدروح تنگ کرتی ہے' — اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اُسے اپنے باپ سے بات کرنے کی اجازت دے دوں۔ میں نے اس شرط پر اجازت دے دی کہ قتل کا ذکر نہ ہو.....

"میں اگلی رات عائشہ کے گھر گیا تو اس کے باپ نے مجھ سے علیحدگی میں پوچھا۔ میں نے اسے ساری کیفیت بتا دی لیکن یہ نہ بتایا کہ میں نے بیوی کو قتل کیا تھا۔ عائشہ نے بھی اسے نہیں بتایا تھا۔ کریم ان پڑھ دیہاتی تھا۔ وہ اسی قدر جانتا تھا، کہ کوئی آسیب ہے۔ اُس نے بتایا کہ رانچی شہر کی جامع مسجد کا خطیب آسیبی بچّوں کا علاج کرتا ہے۔ وہ تعویذ بھی دیتا ہے اور وِردو ظیفے بھی بتاتا ہے۔ کریم نے مشورہ دیا کہ میں اُس کے پاس چلا جاؤں۔ میں دوسرے دن ڈرتے جھجکتے خطیب صاحب سے ملا۔ میں نے انہیں اپنی ساری کیفیت بتائی۔ سوائے قتل کے کوئی بات نہ چھپائی۔ یہاں تک بتایا کہ عائشہ کے قریب جاتا ہوں تو اُس کا چہرہ میری مری

ہوئی بیوی کا چہرہ بن جاتا ہے۔ اور یہ بھی کہ جب اندھیرے میں کیمپ سے عائشہ کے گاؤں کی طرف پیدل جا رہا ہوتا ہوں تو پہلی بیوی کی لاش میرا راستہ روک لیتی ہے..... مجھے توقع تھی کہ وہ مجھے تعویذ دیں گے اور کوئی وظیفہ بتائیں گے۔ انہوں نے پہلا سوال یہ پوچھا۔ 'تم قرآن پڑھے ہوئے ہو؟' میں نے جواب دیا کہ پڑھ لیتا ہوں، سمجھ نہیں سکتا۔ انہوں نے کہا۔ 'یہی ساری خرابی ہے۔ بیٹیا! ہمیشہ یاد رکھو، جو مر جاتا ہے وہ کسی بھی شکل میں واپس نہیں آتا، نہ اس کا جسم آتا ہے نہ رُوح نہ بدروح'.....

"میں نے اُن سے استفسار کیا کہ یہ جو کچھ بھی ہے، خواہ وہم ہی ہے، مجھے کیوں نظر آتا ہے۔ خطیب صاحب معمّر بزرگ تھے۔ انہوں نے ایسی باتیں کیں جن سے میں بہت ہی متاثر ہوا۔ اُن کی باتوں میں محبت اور ہمدردی بہت تھی۔ اس کے اثر سے میں رو پڑا اور انہیں بتا دیا کہ میں نے بیوی کو قتل کیا تھا اور مفرور ہوں۔ میں نے انہیں قتل کی وجہ بتاتے ہوئے یہ بھی بتا دیا کہ اُس کے ایک آدمی کے ساتھ قابلِ اعتراض تعلقات تھے۔ خطیب صاحب نے مجھے بالکل نہیں کہا کہ میں نے ایسا گھناؤنا جرم کیا ہے بلکہ یہ کہا کہ بدکاری کی مجرمہ یا مجرم کو جان سے مار دینا کوئی گناہ نہیں۔ تمہارا جرم صرف یہ ہے کہ تم نے قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ قصّہ مختصر یہ کہ انہوں نے مجھے کوئی تعویذ نہیں دیا۔ نماز پڑھنے کو کہا اور ہر نماز کے بعد مختصر سا ایک وِرد بھی بتا دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس پر زور دیا کہ میں اپنے آپ میں دلیری اور جرأت پیدا کروں اور اس حقیقت کو قبول کر لوں کہ میں نے بیوی کو بدکاری کے الزام میں قتل کیا ہے۔ پھر اُسے ذہن سے اتارنے کی کوشش کروں اور خدا کو یاد کروں.....

"ان کی نصیحتوں اور ہمدردانہ باتوں نے مجھ پر بہت اثر کیا۔ میں نے اُسی روز نماز شروع کر دی مگر میں اپنے آپ میں دلیری پیدا نہ کر سکا۔ جونہی اندھیرا ہوتا میرا دل خوف کی گرفت میں آجاتا۔ عائشہ کے پاس جاتا تو پہلی بیوی

کا خوفناک چہرہ ہمارے درمیان آجاتا اور میرا جسم میرے قبضے سے نکل کر بےجان پتھر بن جاتا...... میں ایک بار پھر خطیب صاحب کے پاس گیا اور اُن سے التجا کی کہ وہ میرے لئے کچھ کریں۔ میں نے انہیں کہا "میرے اندر جرأت پیدا نہیں ہوتی۔ اس کا کوئی علاج کریں" ــــ انہوں نے کہا "کوئی تعویذ اور دنیا کی کوئی طاقت تم میں دلیری اور مردانگی پیدا نہیں کر سکتی۔ سب کچھ تمہارے اندر ہے۔ تم پر نہ کوئی آسیب سوار ہے نہ کوئی بد رُوح۔ تم اپنے آپ پر خود سوار ہو" ــــ اس قسم کی باتیں کرتے کرتے انہوں نے کہا "میں دُعا کروں گا کہ خدا تم پر کوئی ایسی مصیبت نازل کرے کہ تمہارے اندر جو مرد سویا ہوا ہے وہ جاگ اٹھے...... لیکن بیٹا! یہ یاد رکھنا کہ جب تمہارے اندر کا مرد بیدار ہو جائے تو اسے مسلمان مرد بنانا۔ کسی بے گناہ کو قتل کر کے یا بیوی کے ساتھ حیوانوں کی طرح سلوک کر کے اپنے آپ کو مرد نہ سمجھ لینا!"......

"میں ان کی یہ بات نہیں سمجھ سکا اور دل میں دعا کرنے لگا کہ خدا مجھے کسی اور مصیبت سے محفوظ رکھے مگر تھوڑا ہی عرصہ بعد خطیب صاحب کی دعا قبول ہو گئی۔ میں آج بھی عائشہ پر حیران ہوں کہ ایک اَن پڑھ اور دیہاتی لڑکی مجھ جیسے ڈرپوک اور بے کار انسان کے ساتھ کس طرح ثابت قدم رہی۔ اُس نے مجھے میری کمزوریوں کا احساس تک نہیں ہونے دیا اور مجھے خوش رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کا یہ سلوک میرے لئے زنجیر بن گیا تھا ورنہ میں بھاگ جاتا...... خدا نے مجھے بھاگنے کا موقع دے دیا۔ مجھے جبل پور بھیج دیا گیا۔ جس روز میں بیوی سے جدا ہُوا وہ بہت روئی۔ اُس نے مجھ سے کچھ وعدے لئے۔ میں نے اُسے جھوٹی سچی تسلیاں دیں اور کہا کہ چھاؤنی میں مجھے کوارٹر مل جائے گا اور اُسے اپنے ساتھ رکھوں گا۔ لیکن میں نے دل میں طے کر لیا کہ اب رانچی واپس نہیں آؤں گا نہ عائشہ کو جبل پور بلاؤں گا...... میں جبل پور چلا گیا۔ میں نے یہ ارادہ بھی کیا کہ عائشہ کو خط بھی نہیں لکھوں گا۔ وہ اور اُس کے ماں باپ یہ کہہ کر مجھے بھول

جائیں گے کہ ایک مفرور قاتل انہیں دھوکا دے گیا ہے۔ سال دو سال کے انتظار کے بعد وہ عائشہ کی دوسری شادی کر دیں گے۔ لیکن جبل پور جا کر میں نے چند دنوں میں ہی دیکھ لیا کہ پہلی بیوی جو مجھ پر بد رُوح کی طرح قابض تھی، رانچی کے اُس جنگل میں رہ گئی ہے جس میں سے ہر رات گزر کر میں عائشہ کے پاس جایا کرتا تھا۔ جبل پور میں میں اندھیرے میں گیا، تنہا بھی رہا۔ میں نے پہلی بیوی کے متعلق سوچا بھی لیکن اُس کا بھیانک چہرہ مجھے نظر نہیں آیا۔ اُس کی بد رُوح نے مجھے آزاد کر دیا تھا۔ اُس کی جگہ عائشہ مجھ پر قابض ہو گئی۔ فرق یہ تھا کہ یہ بڑی حسین روح تھی جو میرے سامنے آکر مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھتی تھی، میرے ساتھ باتیں کرتی تھی اور کبھی مسکراتے مسکراتے رو بھی پڑتی تھی......

"یہ حقیقت ہے کہ وہ مجھ پر قابض ہو گئی تھی۔ اُسے خط نہ لکھنے اور بھول جانے کے ارادے میرے بس سے باہر ہو گئے اور میں نے اُسے پہلا خط لکھا۔ یقین کریں کہ میری کوشش یہ تھی کہ خط رسمی سا لکھوں گا مگر کوئی غیبی طاقت تھی جو مجھ سے ایسے ایسے الفاظ لکھوا رہی تھی جو میں نے سوچے بھی نہیں تھے۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کسی کو خط نہیں لکھا تھا۔ میرا تھا ہی کون جسے خط لکھتا۔ مجھے خط لکھنا آتا ہی نہیں تھا۔ زندگی میں یہ پہلا خط لکھ کر پڑھا تو میں حیران رہ گیا کیونکہ یہ عشق و محبت کے افسانے کا ایک رومانی حصّہ تھا۔ میری تعلیم صرف دس جماعت تھی اور میں فوجی کلرک تھا۔ میں ایسا خط نہیں لکھ سکتا تھا۔ خط بھیج دیا۔ پھر میں نے آٹھویں دسویں روز عائشہ کو خط لکھنا شروع کر دیا۔ وہ سکول کے کسی بچے سے خط کا جواب لکھواتی تھی۔ ایک بار اُس نے لکھا کہ اگر میں تعلیم یافتہ ہوتی تو آپ کے خط کا جواب اس سے زیادہ پیارا دیتی لیکن مجبوری دیکھئے کہ میں کسی سے خط لکھواتی ہوں اور دل کی دل میں رہ جاتی ہے......

"میں عائشہ کی جدائی میں دیوانہ ہونے لگا۔ مجھے یہاں کوارٹر مل سکتا تھا

یا میں باہر مکان لے سکتا تھا مگر جب بھی سوچا کہ عائشہ کو جبل پور بلالوں میرے
دل پر انجانا سا خوف طاری ہو گیا اور یہ تو مجھے صاف دکھائی دینے لگا کہ پہلی
بیوی کی بدرُوح مجھے پھر اپنے قبضے میں لے لے گی۔ خطیب صاحب کی نصیحت
کے مطابق میں نماز باقاعدگی سے پڑھتا تھا لیکن میں ان کی اس بات کا قائل نہیں
ہُوا تھا کہ بدرُوح محض وہم ہوتا ہے.....

"مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ بدرُوح مجھے صرف اُس وقت پریشان کرتی ہے
جب میں عائشہ کی طرف جا رہا ہوتا ہوں یا اُس کے پاس ہوتا ہوں۔ جبل پور میں
چونکہ عائشہ میرے پاس نہیں تھی، اس لئے بدرُوح بھی نہیں تھی... عائشہ مجھ
سے خطوں میں پوچھتی تھی کہ میں اُسے کب لینے آؤں گا۔ میں اُسے جھوٹ بول
کر ٹال دیتا تھا کہ یہاں کوارٹر نہیں مل رہا۔ میں اُسے ہر مہینے تنخواہ کا زیادہ تر حصّہ
بھیج دیا کرتا تھا.... جبل پور میں چوتھے مہینے میرے ریلیز کا آرڈر آ گیا۔ جنگِ
عظیم ختم ہونے کے بعد فوج کی اُس فالتو نفری کو جسے جنگ کے دوران بھرتی
کیا گیا تھا نوکری سے کچھ پیسہ دے کر سبکدوش کر دیا گیا تھا جسے ریلیز کر دینا کہتے
تھے.....

"مجھے بھی ریلیز کر دیا گیا۔ خاصا پیسہ مل گیا۔ میرا ٹھکانا اب رانچی تھا مگر میں
وہاں جانے سے گھبرا رہا تھا۔ اب یہ سوال بھی پیدا ہو گیا تھا کہ کوئی ذریعہ معاش
پیدا کرنا ہے۔ میں نے اپنے گزارے کے لئے کچھ رقم پاس رکھ لی باقی عائشہ
کو بھیج دی اور یہ بھی لکھ دیا کہ میں فوج سے فارغ ہو گیا ہوں اور اب کوئی کام
ڈھونڈ رہا ہوں۔ چھاؤنی میں ایک مسلمان کی گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کی مرمت
کی ورکشاپ تھی۔ ایک بار میرے دفتر میں اس کا کوئی کام تھا جو میں نے
کر دیا تھا۔ اس طرح اس سے راہ و رسم پیدا ہو گئی تھی۔ میں ریلیز ہُوا تو اُس سے
ملاقات ہوئی۔ میں نے اسے بتایا کہ ذریعۂ معاش کی تلاش میں ہوں۔ اُس نے مجھے
مسلمان اور اپنا محسن سمجھ کر گاڑیوں کی مرمت کا کام سیکھنے کا مشورہ دیا۔ میں مان

گیا اور صرف دو روپے روز پر اپرنٹس کی حیثیت سے اس کی ورکشاپ میں کام کرنے
لگا۔ رہنے کے لئے ایک کمرہ بھی کرائے پر مل گیا۔ میں نے نیا ایڈریس عائشہ کو لکھ
دیا.... ذرا میری حالت کا اندازہ کریں کہ میں عائشہ کو پاس بلانے سے ڈرتا
تھا، لیکن اسے دل سے اتار بھی نہیں سکتا تھا۔ کئی بار ارادہ کیا کہ خط لکھنے چھوڑ دوں
یا بہت عرصے بعد لکھا کروں گا مگر سات دن گزر جاتے تو مجھ پر جیسے کسی چیز
کا قبضہ ہو جاتا۔ میں نہایت خوب صورت خط لکھتا اور جب خط لیٹر بکس میں
ڈال دیتا تو میں اپنے آپ میں آ جاتا۔ مجھے اپنے آپ پر غصّہ بھی آ جاتا کہ مجھے
اپنے اوپر بھی کوئی اختیار نہیں ہے یہی مجھ میں کمزوری تھی.....

"دوسری کمزوری وہی پرانی کہ میں بزدل اور ڈرپوک تھا۔ ایک روز ورکشاپ
میں ایک گاہک کے ساتھ جھگڑا ہو گیا۔ وہ غنڈہ گردی پر اُتر آیا۔ میں دبک کر
اندر گھس گیا۔ میرے مالک نے گاہک کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور گاہک من مانی
کر کے چلا گیا۔ مالک نے مجھے بلا کر کہا۔ "ارے بدبخت! میں نے تمہیں پنجابی سمجھ
کے ورکشاپ میں رکھا تھا کہ کسی کو اونچی بات نہیں کرنے دو گے۔ تم تو ہندوؤں
سے بھی بزدل نکلے"۔ اُس طرف کے لوگ پنجابی مسلمانوں اور پٹھانوں سے بہت
ڈرتے تھے لیکن میں نے پنجاب کے مسلمانوں کی ناک کٹوا دی۔ وہاں بھی میں تنہائی
پسند ہو گیا۔ میں اگر مالک کو بتاتا کہ میں اپنی بیوی کا مفرور قاتل ہوں تو وہ بے ہوش
ہو جاتا.... بہرحال میں پوری توجہ سے کام سیکھتا رہا اور چار پانچ مہینوں میں
آزادانہ کام کرنے کے قابل ہو گیا۔ میری تنخواہ پانچ روپے روزانہ ہو گئی.....

"اور ایک روز عائشہ اپنے باپ کے ساتھ بغیر اطلاع جبل پور پہنچ گئی انہیں
ایڈریس معلوم تھا۔ تلاش کرتے، لوگوں سے پوچھتے پہنچ گئے۔ عائشہ کے باپ نے
کہا۔ "تم ناراض تو ضرور ہو گے کہ تمہاری اجازت کے بغیر ہم لوگ آ گئے لیکن اتنا
عرصہ گزر گیا ہے۔ نہ تم آئے نہ تم نے عائشہ کو بلایا۔ اس سے لوگ طرح طرح کی باتیں

کرتے لگے تھے"۔ وہ دو روز رہ کر چلا گیا۔ عائشہ اپنے ساتھ وہ سارا پلیسے آئی تھی جو مَیں نے اُسے شادی کی پہلی رات دیا تھا اور جو جبل پور سے اُسے بھیجا تھا۔ میں نے دو کمروں کا ایک مکان کرائے پر لے لیا مگر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ رات کا وقت تھا۔ مَیں نے عائشہ کو بستر پر لیٹے دیکھا تو اس کی آنکھیں اُبل کر باہر آ گئیں۔ منہ کھل گیا، زبان باہر لٹک گئی اور دانتوں نے زبان کو وہیں جکڑ لیا۔ مجھے چکر آ گیا اور میں اپنی چارپائی پر گر پڑا۔ عائشہ گھبرا کر اٹھی اور مجھ پر آ گری۔ مَیں نے تقریباً ایک سال اس بدروح کے بغیر گزارا تھا۔ عائشہ آئی تو اس کے ساتھ بدروح بھی آ گئی۔ مَیں نے رونا شروع کر دیا اور عائشہ کچھ پڑھ پڑھ کر مجھے پھونکیں مارنے لگی....

"اسے معلوم تھا کہ رانچی کی جامع مسجد کے خطیب صاحب نے مجھے کیا کہا تھا۔ مَیں نے عائشہ کو بتا دیا تھا۔ اب میری وہی حالت دیکھ کر اس نے کہا— 'مجھے امید تھی کہ آپ اتنا عرصہ مجھ سے الگ رہ کر دلیر ہو گئے ہوں گے،' اُس نے ایسی بات پہلی بار کہی تھی جو مجھے زہریلے تیر کی طرح لگی۔ پھر اس نے کہا— 'خطیب صاحب نے جس طرح آپ کو کہا تھا کہ اپنے آپ میں مردانگی پیدا کریں، آپ اس طرح کیوں نہیں کرتے۔ آپ کو شاید میری ذات کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ پنجابیوں کے متعلق تو سنا تھا کہ بڑے جابر ہوتے ہیں'—

مجھ پر خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ ٹھیک کہتی تھی۔ اگر وہ شریف لڑکی نہ ہوتی تو صاف کہہ دیتی— 'جا کمبخت تُو تو مرد ہی نہیں ہے۔' اُس نے یہی بات شریفانہ الفاظ میں کہہ دی۔ میری زبان ہی بند ہو گئی اور مَیں کتنے ہی دن چپ چاپ رہا۔

"پہلی بیوی کی بدروح نے مجھے بے حال کر دیا۔ مَیں اور عائشہ ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔ رات کو اکثر یوں ہوتا کہ میری آنکھ کھل جاتی اور میں اپنی پہلی بیوی کا خوفناک چہرہ کمرے میں گھومتا پھرتا دیکھتا۔ مَیں پسینے سے نہا جاتا اور

منہ پر چادر یا رضائی ڈال لیتا۔ ایک شام میں چارپائی پر بیٹھا گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ عائشہ نے مذاق سے یا مجھے سوچ سے بیدار کرنے کے لئے پیچھے سے میری گردن پر اپنا ہاتھ رکھا۔ میری ہلکی سی چیخ نکل گئی اور میں بدک کر اٹھا۔ پیچھے دیکھا تو میری پہلی بیوی کی لاش کھڑی تھی۔ وہی چہرہ جو بار بار بیان کرتے مجھے آج بھی ڈر آتا ہے۔ مَیں نے نئی چیز یہ دیکھی کہ اُس کے ہاتھوں پر گوشت نہیں تھا۔ ہاتھوں اور انگلیوں کی ہڈیاں تھیں اور ہڈیوں کے ڈھانچے آگے کو تھے جیسے آگے بڑھ کر میری گردن کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیں گے۔ فوراً ہی لاش عائشہ بن گئی۔ بمشکل دو سیکنڈ لگے ہوں گے۔ میں سر پکڑ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ عائشہ میں اب یہ تبدیلی آ گئی تھی کہ میرے پاس بیٹھنے کی بجائے وہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ اس نے جب مجھے کھانا کھانے کے لئے بلایا تو اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی ہے.....

"اس کی بے رخی دیکھ کر مجھے اُس پر رحم آیا اور یہ افسوس بھی کہ عائشہ جیسی صابر لڑکی بھی مجھ سے متنفر ہو گئی ہے۔ وہ کب تک صبر کرتی۔ شادی کئے دو سال ہو چکے تھے۔ مجھ میں کوئی ایک بھی خوبی نہیں تھی۔ میں جسمانی لحاظ سے بھی بیکار تھا اور مزاج کے لحاظ سے تو مَیں بالکل مُردہ تھا۔ ہنسی مذاق کی بات تو مجھے لگی تھی۔ میں چارپائی پر بیٹھا اور لیٹ گیا۔ اس نے بے رخی سے پوچھا— 'بتی جلتی رہے یا بجھا دوں؟' میں نے اسے خالی خالی نگاہوں سے دیکھا۔ اُس نے بتی نہ بجھائی اور بیگانوں کی طرح اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لئے تھے.....

"اس واقعہ کے چھ سات روز بعد میں ورکشاپ میں گیا تو مالک کو پریشان دیکھا۔ اُس نے بتایا کہ شہر میں فساد شروع ہو گیا ہے۔ رات کو گیارہ مسلمان قتل ہو چکے ہیں۔ یہ اگست ۱۹۴۷ء کا مہینہ تھا۔ جبل پور ہندوؤں کی اکثریت کا علاقہ تھا اور پاکستان سے بہت دُور۔ وہاں مسلمانوں کا خدا ہی حافظ تھا۔ مسلم کش فسادا

تیزی سے پھیل گئے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد پولیس بھی ہندوؤں سے مل گئی اور راہ چلتے مسلمانوں کا قتل معمولی سی بات ہو گئی۔ یہ صحیح ہے کہ وہاں مسلمانوں کا حشر مشرقی پنجاب والا نہیں ہوا لیکن کسی مسلمان کے گھر پہ حملہ اور مسلمان کا قتل وہاں ایسے ہی تھا جیسے کسی نے مکھی مار دی۔ ہماری ورکشاپ بند ہو گئی۔ مالک نے مجھے فساد کی پہلی اطلاع ملتے ہی کہہ دیا تھا کہ پنجاب کی طرف نکل جاؤ یا بنگال کی طرف، یہاں اب کوئی مسلمان زندہ نہیں رہ سکے گا۔ میں نے پرواہ نہیں کی تھی، نہ ہی مجھ میں اتنی ہمت تھی کہ کہیں نکل جاتا.... فساد بڑھ گئے تو عائشہ مجھے ہر شام کہتی کہ یہاں سے مسلمان بنگال کی طرف جا رہے ہیں، چلو ہم بھی نکل چلیں مگر میں اسے ٹالتا رہا...

"ہم جس محلے میں رہتے تھے وہاں چند ایک گھر مسلمانوں کے تھے۔ یہ شہر اور چھاؤنی کے درمیان ایک علاقہ تھا۔ ایک رات ہمارے گھر سے چھ سات گھر کم نی نہیں آتی تھی۔ خوف، اداسیوں اور پہلی بیوی کی بدروح نے مجھے لاش بنا دیا تھا۔ عائشہ نے امید کا دامن چھوڑ دیا تھا۔ میں نے یہاں تک سوچ لیا کہ عائشہ ایک نہ ایک دن میرے ہاتھ سے نکل جائے گی اور اپنا دل بہلانے کا کوئی ذریعہ ڈھونڈ لے گی۔ اور جب کبھی ایسا ہوا میں اس کے راستے میں نہیں آؤں گا۔ خاموشی سے اپنے آپ کو ختم کر لوں گا۔ اس نے میرے لئے بہت قربانی دی تھی۔ اب مجھے قربانی دینی تھی۔ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ سوچ کر میرا کیا حشر ہوا ہو گا۔ میرا خون کھولتا رہتا اور میں اپنا خون پیتا رہتا تھا....

"ایک رات عائشہ نے بھی مجھے میرے حال پہ پھینک دیا۔ میں رات کو گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اچانک آنکھ کھل گئی۔ بالکل سامنے روشندان تھا۔ میں نے روشندان میں پہلی بیوی کا چہرہ دیکھا۔ وہی حالت وہی ہیبت۔ میں نے چادر اتار پھینکی اور اندھیرے کمرے میں کھڑا ہو کے بدروح کو للکارا — "آجا دوزخی روح! نیچے اتر اور مجھے ختم کر دے۔ چڑیل مر گئی ہے تو بھی خدا نے تجھے کھلا چھوڑ رکھا ہے۔

تجھے دوزخ نے بھی قبول نہیں کیا۔ آ مجھے اپنے ساتھ لے چل" — اچانک کمرہ روشن ہو گیا۔ میرے سامنے فرش پہ پہلی بیوی کی لاش کھڑی تھی۔ اس نے کہا۔ "خدا کے لئے لیٹ جاؤ۔ وہ تو مر کر آپ کے جہنم سے آزاد ہو گئی ہے۔ اب میں اس دوزخ میں جل رہی ہوں" — فوراً ہی یہ کھڑی لاش عائشہ بن گئی۔ وہ مجھے لعن طعن کر رہی تھی۔ اس نے کہا "آپ سو جائیں میں لٹھ لے کر باہر پہرہ دیتی ہوں۔ بدروح آئے تو مجھے پکارنا" — یہ عائشہ تھی جو میری یہ حالت دیکھ کر مجھے بچوں کی طرح اپنے ساتھ لگا لیا کرتی تھی۔ اب وہ بھی طعنے دینے

دور ہندوؤں نے مسلمانوں کے ایک گھر پہ حملہ کر دیا۔ گھر کے چھ افراد قتل ہو گئے اور گھر لوٹ لیا گیا۔ عائشہ نے مجھے کہا کہ اب بھی وقت ہے ہمیں نکل جانا چاہیئے مگر میں نہیں مانا۔ پندرہ اگست کے دو چار روز بعد ہمارے پڑوس کے ایک اور مسلمان گھرانے پہ حملہ ہوا۔ مجھے اس گھرانے کے بچوں اور عورتوں کی چیخیں آج بھی یاد ہیں۔ عائشہ ڈر سے کانپتی میرے پاس آ گئی۔ میں اس سے زیادہ ڈر رہا تھا۔ کوئی نصف گھنٹہ بعد چیخیں تھم گئیں۔ گلی میں بھاگتے قدموں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ جب بالکل خاموشی طاری ہو گئی تو عائشہ نے کہا — "اب بھی وقت ہے۔ چلو ابھی نکل کر ریلوے سٹیشن چلے چلتے ہیں۔ کلکتہ کی طرف جانے والی کسی گاڑی میں بیٹھ جائیں گے، اس نے کہا — "کل ہماری باری ہے۔" میں نے اسے ٹال دیا۔ اور میرے دماغ میں یہ سوچ بھی آئی کہ اچھا ہو گا ہندو ہم دونوں کو ختم کر جائیں گے۔ میں قتل ہونے کے لئے تیار تھا....

"دوسرے دن واقعی ہماری باری تھی لیکن بر وقت پتہ چل گیا۔ عائشہ ملنسار لڑکی تھی۔ ہمارے دائیں اور بائیں ہندوؤں کے گھر تھے۔ عائشہ نے ان کی عورتوں خصوصاً اُن کی جوان لڑکیوں کے ساتھ گہرے مراسم پیدا کر رکھے تھے۔ ان لڑکیوں نے دوسرے دن عائشہ سے کہا کہ آج شام اندھیرا ہوتے ہی یہاں نکل جاؤ۔ رات تمہارے گھر حملہ ہو گا۔ گذشتہ رات ہمارے پڑوس میں جس گھر

پر حملہ ہوا تھا اس کے پانچ افراد قتل ہوئے، دو بُری طرح زخمی ہوئے اور ذلت یہ ہوئی کہ ایک جوان شادی شدہ لڑکی اغوا ہو گئی تھی۔ عائشہ بھی جوان لڑکی تھی۔ گھر میں کم و بیش پانچ ہزار روپیہ تھا۔ عائشہ کو حملے کی اطلاع ملی تو اُس نے سامان باندھنا شروع کر دیا۔ میں جانے پر رضامند نہیں ہو رہا تھا۔ عائشہ نے مجھے لعنت ملامت کر کے تیار کیا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا ——

"آپ چاہتے ہیں کہ مجھے ہندو اپنے ساتھ لے جائیں۔ اگر آپ کو یہیں رہنا ہے تو مجھے اسی طرح ختم کر دیں، جس طرح آپ نے پہلی بیوی کو قتل کیا تھا میری بد روح آپ کو پریشان نہیں کرے گی کیونکہ میں خوشی سے آپ کے ہاتھوں قتل ہونا چاہتی ہوں"۔ میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔۔۔

"شام کا اندھیرا گہرا ہوتے ہی ایک سوٹ کیس اُس نے اٹھایا، دوسرا میں نے اٹھایا اور ہم ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔ پلیٹ فارم پر تِل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ مسلمان کنبے ہماری طرح ایک ایک دو دو ٹرنک اور سوٹ کیس اٹھائے کہیں بھاگ جانے کو ریلوے سٹیشن میں جمع ہو گئے تھے۔ جس طرف بھی جانے والی گاڑی آتی تھی مسلمان اس پر دھاوا بول دیتے تھے۔ میں پنجاب کی طرف نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ وہاں بیوی کے قتل میں پکڑے جانے کا ڈر تھا۔ میں نے مشرقی پاکستان جانے کا ارادہ کیا۔ دو ٹکٹ لے لئے اور کلکتے جانے والی گاڑی کے متعلق پوچھنے لگا۔ بہت دیر بعد اُدھر جانے والی گاڑی آ گئی اور ہم اس ہجوم میں گھس گئے جو گاڑی کے ڈبوں میں ٹھُونسا ہُوا تھا۔ یہ سب مسلمان تھے جو مشرقی پاکستان جا رہے تھے۔ ان میں کئی لوگ زخمی بھی تھے۔ عورتیں بھی تھیں۔ وہ سب رو رہی تھیں۔ ان سے پتہ چلا کہ سارے ہندوستان میں مسلمانوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔۔۔۔

"یہ سفر بہت ہی تکلیف دہ تھا۔ کہیں بیٹھنے کو جگہ نہیں تھی۔ اَدھ موتے

ہو کر ہم کلکتے پہنچ گئے۔ گاڑی کو وہیں تک جانا تھا۔ کلکتہ ریلوے سٹیشن کا تو یہ حال تھا کہ اتنے بڑے شہر کی جیسے ساری مسلمان آبادی سٹیشن میں اکٹھی ہو گئی تھی۔ یہاں بھی سب لوگ ہراساں تھے، عورتوں اور بچوں کو وہاں بھی روتے دیکھا۔ ان میں زخمی بھی دیکھے۔ وہاں پتہ چلا کہ کلکتے میں مسلمانوں کا بہت خون خرابہ ہُوا ہے اور ہو رہا تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ بہت سے مسلمان مشرقی پاکستان کی طرف پیدل ہی روانہ ہو گئے ہیں۔ مغربی بنگال کے مسلمانوں کو وہاں کے ہندو پاکستان بنانے کی بڑی ہی ظالمانہ سزا دے رہے تھے۔ آج بنگالی مسلمان نے اُسی ہندو کو اپنا ہمدرد سمجھ کر اپنا ملک اُس کے حوالے کر دیا ہے۔۔۔۔۔ میں نے اگر آپ کو یہ بتانا شروع کر دیا کہ اگست ۱۹۴۷ء میں کلکتے میں ہندوؤں نے نہتے مسلمانوں کا کیا حال کر دیا تھا تو میری کہانی بیچ میں رہ جائے گی۔ مختصر یہ کہ کلکتہ سے مشرقی پاکستان کی سرحد تک کوئی ریل گاڑی نہیں جا رہی تھی۔ مسلمان وہاں اس امید پر جمع ہو گئے تھے کہ شاید کوئی گاڑی انہیں اس شہر سے نکال کر اپنے نئے ملک میں پہنچا دے۔ اگر گاڑی نہ جائے تو ریلوے سٹیشن میں محفوظ تو رہیں گے۔ مگر وہاں وہ محفوظ نہ رہے۔۔۔۔

"ہندوؤں نے جب دیکھا کہ مسلمانوں نے ریلوے سٹیشن میں پناہ لے لی ہے تو وہ وہاں منڈلانے لگے۔ کلکتے کا ریلوے سٹیشن لاہور کی نسبت وسیع سٹیشن ہے۔ ابتدا میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو یہ چکمے دیئے کہ کسی گھرانے کو کہتے کہ ہم مسلمان ہیں، ہمارے ساتھ آؤ۔ ایک بس مشرقی پاکستان جا رہی ہے۔ اس کے بعد یہ گھرانہ کسی کو نظر نہیں آیا۔ پھر ریلوے سٹیشن کا پانی بند کر دیا گیا۔ کھانے کے لئے وہاں کچھ نہیں ملتا تھا۔ بچے بھوک اور پیاس سے مر رہے تھے کوئی بچہ پانی کی تلاش میں باہر نکل جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔ مائیں اور باپ بھوک سے بلبلاتے بچوں کے لئے پانی کا گھونٹ یا کچھ کھانے کو لانے

کے لئے باہر جاتے تو قتل ہو جاتے۔ بہت سے دن گزر گئے تو راتوں کو اس طرح حملے ہونے لگے کہ چند ایک ہندو ایک دو سوئی ہوئی جوان لڑکیوں کو اٹھا لے جاتے یا چند ایک مردوں کو سوتے میں قتل کر جاتے۔ مسلمانوں پر یہ حملے تیز ہو گئے تو وہاں سے کنبہ در کنبہ نکلنے لگے۔ سنا تھا کہ ایک ریل گاڑی میں مہاجرین کا ایک قافلہ مشرقی پاکستان کے لئے روانہ ہوا تھا مگر مشرقی پاکستان کی سرحد میں جب یہ گاڑی داخل ہوئی تو وہ لاشوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کے بعد ادھر کوئی گاڑی نہیں گئی.....

"مجھے صرف عائشہ کا غم تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اپنے پاس جو چار پانچ ہزار روپیہ ہے وہ کسی ہندو کو دے دوں اور اُسے کہوں کہ ہمیں مشرقی پاکستان پہنچا دے لیکن ہندوؤں پہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عائشہ جیسی اچھی شکل و صورت کی جوان لڑکی کو وہ کبھی نہ چھوڑتے۔ میں نے بزدلوں کی طرح یہ بھی سوچا کہ عائشہ کو وہیں چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ میں اس کے لئے ایک بے کار خاوند تھا اور اسے قیدی بنا رکھا تھا۔ اُس کے دل میں اب میری ہمدردی بھی نہیں رہی تھی۔ جس کا اظہار وہ جبل پور میں کر چکی تھی مگر ایسے اقدام کی مجھ میں جرأت نہیں تھی۔ میں اذّیت میں مبتلا تھا۔ بھوک نے الگ بے حال کر رکھا تھا۔ پانی کا انتظام تو میں کر لیتا تھا۔ ایک روز عائشہ نے کہا کہ یہاں سے پیدل نکل چلیں۔

اس نے بنگالی عورتوں سے معلوم کر لیا تھا کہ مشرقی پاکستان کی سرحد کس طرف ہے اور کتنی دور ہے۔ عائشہ نے مجھے بتایا کہ اس نے بنگالی عورتوں کو جب یہ بتایا کہ اُس کا خاوند پنجابی ہے تو انہوں نے حیران ہو کر کہا۔۔۔ 'ارے پنجابی خاوند ہے تو وہ ہندوؤں سے ڈرتا ہے؟ پنجابی مسلمان کے سامنے کوئی ہندو نہیں ٹھہر سکتا'۔۔۔ عائشہ نے یہ کہہ کر میری مردانگی کو بھڑکانے کی کوشش کی لیکن میں ڈر کے مارے اندر ہی اندر کانپنے لگا۔ تاہم میں نے اُسے کہا کہ موقع دیکھ کر نکل جائیں گے.....

"ریلوے سٹیشن سے نکل جانا اور زندہ رہنا کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ میرا چونکہ دماغ ٹھکانے نہیں تھا، اس لئے کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ عائشہ نے بتایا کہ پولیس کو رشوت دے کر نکلا جا سکتا ہے۔ سٹیشن کے اندر اور باہر پولیس موجود تھی۔ یہ ہندو پولیس تھی جو صرف ہندوؤں کی مدد کرتی تھی اور مسلمانوں پر حملے کراتی تھی۔ میں نے پولیس کے ایک سپاہی سے بات کی تو اُس نے کہا۔۔۔ 'پانچ سو روپیہ لیں گے اور تم دونوں کو شہر سے دور چھوڑ آئیں گے جہاں کوئی خطرہ نہیں۔ آگے پیدل چلے جانا'۔۔۔ خطرہ شہر میں ہی تھا۔ میں نے اُسے چار سو روپے پر راضی کر لیا۔ سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے وہ ہم دونوں کو ساتھ لے گیا۔ اُس کے ساتھ ایک سپاہی اور تھا۔ سٹیشن کے باہر ہندو برچھیاں اور دھا لیے کھڑے تھے۔ دھا (دیادا) بنگالیوں کا ایک ہتھیار ہے جو چھرا ہی ہوتا ہے لیکن آگے سے بڑھا ہوتا ہے۔ ہمیں سپاہیوں کے ساتھ دیکھ کر وہ ہم سے دور رہے۔ سپاہیوں کے پاس رائفلیں تھیں۔ سپاہیوں نے مجھے کہا۔۔۔ 'ٹیکسی یا تانگے کا خرچ تم دو گے'۔۔۔ میں نے یہ شرط بھی مان لی۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور سے بات کی۔ اس نے پورا ایک سو روپیہ مانگا۔ ان دنوں پولیس اور ٹیکسی ڈرائیوروں نے مہاجرین سے بے پناہ دولت کمائی تھی۔ مَیں نے پورا ایک سو روپیہ پہلے ہی دے دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے پاس پیسے بہت تھے.....

"ٹیکسی چل پڑی۔ پولیس کے دونوں سپاہی اگلی سیٹ پہ بیٹھ گئے تھے۔ شہر میں ہم جدھر سے بھی گزرے سڑکوں پہ لاشیں پڑی تھیں جنہیں دیکھ کر میرا دل ڈوبتا چلا گیا۔ دہشت نے میرا خون خشک کر دیا۔ کچھ دکانیں جل رہی تھیں اور کئی مکانوں کو بھی میں نے جلتے دیکھا۔ لاشوں میں چھوٹے چھوٹے بچوں کی بھی لاشیں تھیں۔ مَیں نے باہر دیکھنا چھوڑ دیا۔ سڑکیں ویران تھیں، اس لیے ٹیکسی بہت ہی تیز جا رہی تھی۔ پھر ٹیکسی شہر سے نکل گئی اور ویرانے میں داخل ہو گئی۔ آگے جہاں آبادی کا نشان تک نہ رہا ٹیکسی رک گئی اور ہمیں اتار دیا گیا۔ ایک سپاہی نے ہمیں کہا کہ سڑک پر نہ جانا

ورنہ مارے جاؤ گے۔ سڑک سے دُور دُور کھیتوں اور جنگل میں سے جانا۔
میں نے انہیں چار سو روپیہ ادا کر دیا اور وہ چلے گئے۔ سپاہی نے ٹھیک کہا
تھا کہ سڑک پر نہ جانا۔ میں نے سڑک پر، شہر سے اتنی دور بھی لاشیں دیکھی
تھیں۔ یہ مہاجرین کے قافلوں کی لاشیں تھیں۔ سپاہیوں نے ہمیں مشرقی پاکستان
کی سمت بتا دی تھی.....

"تھوڑی دیر بعد سورج غروب ہو گیا۔ ہم سڑک سے اتر کر دور چلے گئے
اور مشرقی پاکستان کی سمت روانہ ہو گئے۔ ایک سوٹ کیس میں نے اٹھا رکھا
تھا ایک عائشہ نے۔ ساون کا مہینہ تھا۔ دلدل اور پانی جگہ جگہ جمع تھا۔ میرا دل
بہت ہی کمزور ہو گیا تھا۔ جوں جوں اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا دل اور زیادہ
کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ عائشہ مجھ سے کوئی بات کرتی یا کوئی سوال پوچھتی تو
جواب دیتے میری زبان لڑکھڑا جاتی تھی۔ میں نے اپنے طور پر عائشہ کے
ساتھ کوئی بات نہ کی۔ بھوک نے جسم کو الگ بے جان کر رکھا تھا۔ ایک بار
عائشہ نے پوچھا، راستے میں ہندو مل گئے تو آپ کیا کریں گے؟ میرا پسینہ نکل آیا۔
میں پھیکی سی ہنسی ہنس پڑا۔ منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ میں اس قدر ڈرپوک
ہو چکا تھا کہ عائشہ کو جھوٹی تسلی بھی نہ دے سکا۔ یہ الفاظ زبان پر لانے کی
جرأت نہ ہوئی کہ میں ہندوؤں کا مقابلہ کروں گا.....

"ایک جگہ پانی جمع تھا۔ ہم دونوں نے پیا اور ایک خشک جگہ دیکھ کر
وہاں لیٹ گئے۔ میرے جسم میں طاقت نہیں رہی تھی۔ عائشہ میرے قریب
لیٹی اور ہم دونوں فوراً سو گئے۔ یہ آدھی رات کا وقت تھا۔ اچانک میری
آنکھ کھل گئی۔ میرے سامنے ایک درخت تھا۔ اس کی ٹہنیوں میں مجھے پہلی بیوی
کا چہرہ نظر آیا۔ اس کا حلیہ اُسی طرح بھیانک تھا۔ میں تھر تھر کانپنے لگا اور میں
اُٹھ بیٹھا، پھر میں وہ ورد کرنے لگا جو رانچی کے خطیب صاحب نے مجھے بتایا
تھا۔ وہاں سے یہ خوفناک چہرہ اتر کر میرے قریب آ گیا۔ میں نے بلند آواز سے

ورد شروع کر دیا۔ عائشہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے مجھے طعنہ دیا۔ "تم مجھے
ہندوؤں سے ضرور ہی بچا لو گے"۔ پھر اس نے غصے سے کہا۔ "کیا نظر آتا ہے
تمہیں؟ مجھے بھی دکھاؤ ذرا؟" اس نے مجھے پہلی بار تم اور تمہیں کہا تھا۔ اس
سے اُس کی نفرت کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ ٹھیک کہتی تھی کہ میں اُسے ہندوؤں سے
نہیں بچا سکوں گا۔ بہرحال اُس کے جاگنے اور بولنے کا یہ فائدہ ہوا کہ بدروح
کا چہرہ غائب ہو گیا۔ میں نے عائشہ سے کچھ بھی نہ کہا اور لیٹ گیا۔ خدا
نے مجھے بڑے ہی سخت امتحان میں ڈال دیا تھا.....

"سورج کی تپش نے مجھے جگا دیا۔ عائشہ گہری نیند سو رہی تھی۔
سورج چڑھ آیا تھا۔ میں نے عائشہ کو جگایا اور ہم چل پڑے۔ اس علاقے کی
آبادیاں پنجاب کی طرح نہیں ہوتیں۔ پانی کے قدرتی تالاب ہوتے ہیں۔ ان میں
موٹے بانسوں کے ستون کھڑے کر کے ان پر بانسوں کی جھگیاں بنی ہوتی ہیں۔
یہی تالاب ان کی کھیتی ہوتی ہے۔ اس میں سے وہ لوگ مچھلیاں پکڑ کر کھاتے
ہیں۔ تالابوں سے ہٹ کر دھان کی کھیتیاں ہوتی ہیں۔ دُور دُور بانسوں کی
جھونپڑیاں اور تالابوں میں چھوٹی کشتیاں نظر آ رہی تھیں۔ ہم ان سے بچتے چلے جا
رہے تھے۔ میں نے کوئی نصف میل دور چار آدمی اسی سمت جاتے دیکھے جدھر
ہم جا رہے تھے۔ ان کے پاس کوئی سامان نہیں تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ
مہاجر نہیں ہیں۔ وہ ایک ٹیکری کی اوٹ میں چلے گئے۔ یہ ٹیکری آگے گھوم کر
ہمارے راستے میں آتی اور وہاں ختم ہو جاتی تھی۔ ہم وہاں پہنچے تو آگے سے اچانک
وہ چاروں آدمی آ گئے۔ چاروں کے پاس خنجر اور ڈھالے تھے۔ انہوں نے گھات
لگائی تھی۔ پہلے تو انہوں نے بنگالی میں کچھ کہا جو میں نہ سمجھ سکا۔ میں کانپنے
لگا۔ ایک نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھے کہا کہ دونوں سوٹ کیس دے دو
اور یہ عورت بھی ہمارے حوالے کر دو ہم تمہیں زندہ چھوڑ دیں گے.....

"مجھ میں ذرا بھر جرأت نہیں تھی۔ میری غیرت بھی مرگئی۔ میں نے

کوئی جواب نہ دیا۔ عائشہ میرے پیچھے ہو گئی۔ ان چاروں کے ہاتھوں میں چمکتے ہوئے ہتھیار تھے۔ جسمانی لحاظ سے وہ میرے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھے۔ دُبلے پتلے، کالے کالے بنگالی تھے۔ ان کے دو جسم ملا کر میرا اکیلا جسم بنتا تھا مگر جرأت کے بغیر بھینسے جتنا جسم بھی بے کار ہو جاتا ہے۔ مجھے چکر آ گیا۔ دماغ کی نسیں اکڑ گئیں۔ زبان بند ہو گئی، اور میں مٹی کا بُت بن گیا۔ ایک آدمی آگے بڑھا۔ اُس نے میرے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ دوسرے نے عائشہ کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا اور دو نے میرے پیچھے آ کر عائشہ کو بازوؤں سے پکڑ لیا۔ عائشہ کی چیخیں نکل گئیں۔ ایک نے مجھے بازو سے پکڑا اور آگے کو چلا کر بولا "تم جاؤ"۔ اور میں چل پڑا۔ عائشہ چیخ رہی تھی۔ مجھ پر جو اثر ہو رہا تھا وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کچھ یوں تھا کہ کوئی چیز مجھے آگے کو دھکیل رہی تھی اور کوئی طاقت مجھے پیچھے کو گھسیٹ رہی تھی۔ میری عقل مر گئی تھی، دل مر گیا تھا، میں مرنے کی دعائیں مانگا کرتا تھا، خودکشی کا ارادہ بھی کیا تھا مگر موت سامنے آئی تو میں اپنی دولت اپنی بیوی اور اپنی غیرت اس کے حوالے کر کے میدان چھوڑ گیا۔ میں پیچھے دیکھنے کی بھی جرأت نہیں کر رہا تھا...

"مجھے عائشہ کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر مجھے عائشہ کی یہ چیخ نما آواز سنائی دی — "او بے غیرت، بزدل۔ اب میری بدرُوح تجھے ساری عمر چین نہیں لینے دے گی"— پھر اس نے ایک ایسا لفظ کہا جو شرافت کے دائرے سے باہر ہے اس لئے وہ میں آپ کو لکھوا نہیں سکتا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کوئی بیس قدم دور دو ہندوؤں نے عائشہ کو زمین پر گرا لیا تھا اور اُس کے کپڑے نوچ رہے تھے۔ عائشہ تڑپ اور چیخ رہی تھی۔ دو ہندو میری طرف پیٹھ کئے کھڑے تھے۔ پھر مجھے معلوم نہیں کہ میرے اندر کیسا دھماکا ہُوا۔ وہی حالت ہو گئی جو پہلی بیوی کو قتل کرنے سے پہلے ہوئی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میں نے بیس قدم کا فاصلہ اُڑ کر طے کیا، دوڑ کر کیا یا آہستہ آہستہ چل کر۔ مجھ پر جیسے غشی

طاری ہو گئی تھی۔ ہوش اُس وقت آیا جب اُن دو میں سے ایک بنگالی جو میری طرف پیٹھ کر کے کھڑے تھے، میرے گھونسے سے دور جا پڑا اور اُس کے ہاتھ سے تلوار نما چھُرا ایک طرف گر چکا تھا۔ میں نے اسے کنپٹی پر گھونسہ مارا تھا۔ وہ یقیناً بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے دوڑ کر اس کا چھُرا اٹھا لیا.....

"دوسرے کے پاس خنجر تھا۔ وہ میرے اوپر پہنچ چکا تھا۔ اُس نے مجھے نیچے سے خنجر کا وار کیا۔ وہ میرا پیٹ پھاڑنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی کلائی اُس کی کلائی پر مار کر وار روک لیا اور چھُرے کی نوک پوری طاقت سے اس کی پسلیوں کے بیچے ماری۔ کم از کم چار پانچ چھُرا اس کے اندر چلا گیا۔ وہ پیچھے ہٹا تو میں نے چھُرا کھینچ کر اُس کے پیٹ میں دوسرا وار کیا اور چھُرے کو ایک طرف زور سے جھٹکا دیا۔ اُس کی انتڑیاں باہر آ گئیں۔ مجھے اس کی چیخ آج بھی یاد ہے۔ اب میں پوری طرح ہوش میں تھا۔ دل میں کوئی خوف، کوئی شک کوئی شبہ نہیں تھا۔ اُدھر عائشہ کو ننگا کرنے والے دو آدمی دھالے کر مجھ پر آئے۔ عائشہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کی عزت محفوظ تھی۔ میں نے دوڑ کر ایک مریل سے بنگالی کو اچھل کر سینے میں لات ماری۔ وہ بہت دور پیچھے جا پڑا اور کا دھا گر پڑا۔ دوسرے نے دھا کا وار کیا۔ میں سنبھل تو چکا تھا، لیکن اُس کا ہتھیار میرے بائیں بازو کو زخمی کر گیا۔ اگر میں پھرتی نہ کرتا تو اس کا وار میرا پیٹ چاک کر سکتا تھا۔ وہ وار کر کے ذرا جھکا۔ میں نے اسے سیدھا نہیں ہونے دیا۔ خدا نے قد اچھا اور بازو لمبے دیئے ہیں۔ میں نے اوپر سے اُس کی پیٹھ پر چھُرا مارا۔ مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ مجھ میں اتنی زیادہ طاقت ہے۔ چھُرا آدھا اس کی پیٹھ میں چلا گیا اور اس کا دھا گر پڑا.....

" اور وہ جو میری سیدھی لات سے دور جا گرا تھا اس کا دھا عائشہ نے اٹھا لیا تھا۔ وہ اُسے مارنے کی کوشش کر رہی تھی اور منہ وہ ہاتھ جوڑ کر منّت کر رہا تھا اور بچنے کے لئے پینترے بدل رہا تھا۔ میں اب انسان

نہیں درندہ بن چکا تھا۔ میں نے دوڑ کر اُسے بازو سے پکڑا اور بازو مروڑا
تو وہ گھوم گیا۔ میں نے اس کی پیٹھ پر پوری طاقت سے چھرا مارا۔ ایک پھر دوسرا
اور وہ چیخیں مارتا گر پڑا۔ اب وہ رہ گیا جسے میں نے کنپٹی پر گھونسہ مارا تھا وہ
بے ہوش پڑا تھا۔ عائشہ نے کہا۔ "دفع کرو اسے پڑا رہنے دو۔ آؤ چلیں"۔
میں نے اسے کہا۔ "سانپ کا ایک بھی بچہ نہیں چھوڑوں گا"۔ میں اس کے
پاس بیٹھ گیا۔ اُس کی گردن پہ چھرا رکھا اور اس کی شہ رگ کاٹ دی۔ آگے ہڈی
تھی اس لئے اس کی گردن جسم سے الگ نہ ہو سکی۔"

(محترم رئیس الدین نے مجھے بازو پر زخم کا
نشان دکھایا جہاں بنگالی کا دھالگا تھا۔
خاصا گہرا زخم ہے۔ ٹھیک ہو کر بھی پتہ چل
جاتا ہے کہ کتنا گہرا ہوگا۔ انہوں نے یہ
چھرا یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھا تھا
مگر ۱۹۷۲ء میں مشرقی پاکستان سے فرار
کے وقت وہیں رہ گیا تھا)

"عائشہ مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اتنا خون اور لاشیں دیکھ کر اس
کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ میں نے اسے کہا۔ "ڈرو نہیں۔ تم پنجابی مسلمان کی بیوی
ہو۔ چلو"۔ ہم نے سوٹ کیس اٹھائے اور چل پڑے۔ مجھے شک ہونے لگا کہ یہ
میں نہیں ہوں۔ یہ رئیس الدین نہیں ہے۔ میں نے اپنے بازو سے خون بہتا
دیکھا تو ایسے محسوس ہوا جیسے جسم سے فاسد خون نکل رہا ہے۔ میری بزدلی
اور سارے خوف بازو کے زخم کے راستے نکل گئے۔ عائشہ نے سوٹ کیس کھولا
اور ایک کپڑا نکال کر زخم پہ باندھ دیا۔ میں نے اسے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ یہ زخم
کچھ بھی نہیں"۔ حالانکہ زخم بہت گہرا تھا۔ میں بالکل ہی بدل چکا تھا۔ جسم ہلکا
پھلکا ہو گیا تھا۔ دماغ پر کوئی ناگوار بوجھ نہیں تھا۔ آگے گئے تو میں اچانک

رک گیا۔ سوٹ کیس رکھ دیا اور عائشہ کو بازوؤں میں لے کر گلے لگا لیا۔ میں نے
اُسے اپنے ساتھ اس قدر زور سے دبایا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔ مجھے پہلی بیوی
کی بدروح نظر نہیں آئی۔ میں نے عائشہ سے کہا۔ وہ مر گئی ہے..... میری پہلی
بیوی ---- مجھے رانچی والے خطیب صاحب کے الفاظ یاد آ گئے "تمہارے
لئے دعا کروں گا کہ خدا تم پر کوئی ایسی مصیبت نازل کرے کہ تمہارے اندر
جو مرد سویا ہوا ہے وہ جاگ اٹھے"۔ ان کی دعا قبول ہو گئی تھی اپنا اور
دشمن کا خون بہا کر میری مردانگی جاگ اٹھی تھی۔ انہوں نے ٹھیک کہا تھا تم پر نہ
کوئی بدروح سوار ہے نہ کوئی آسیب، تم خود اپنے آپ پر سوار ہو۔ سب کچھ
تمہارے اندر ہے طاقت بھی، کمزوریاں بھی.....

"میں اپنی کہانی یہی بتانے کے لئے سنا رہا ہوں کہ انسان کے اندر سب
کچھ موجود ہوتا ہے۔ قوت بھی اور کمزوریاں بھی اور یہ آپ پر منحصر ہے
کہ اپنی کمزوریوں کو ابھاریں یا قوت کو..... ہم چلے جا رہے تھے میرے ہاتھ
میں چھرا تھا۔ عائشہ نے کہا "تیز چلو۔ کافر پھر آ جائیں گے"۔ اُس پر دہشت
طاری ہو گئی تھی۔ میں نے اسے ایک بار پھر بازو کے گھیرے میں لے لیا اور کہا۔
"ڈرو نہیں۔ میں جو ساتھ ہوں"---- بھوک سے ہمارا بُرا حال ہو رہا تھا۔
پیاس بھی پریشان کر رہی تھی۔ پانی کی وہاں کمی نہیں تھی۔ بھوک کا مسئلہ ذرا
ٹیڑھا تھا۔ چلتے چلتے ایک تالاب کے کنارے ایک جھونپڑا نظر آیا۔ باہر
دو بچے کھیل رہے تھے۔ میں نے عائشہ سے یہ کہہ کر کہ آؤ تمہیں کھانا کھلاؤں
جھونپڑے کی طرف چل پڑا۔ عائشہ نے مجھے روکا کہنے لگی --- "یہ ہندوؤں
کا گھر معلوم ہوتا ہے۔ نہ جاؤ"--- میں شیر ہو گیا تھا اس کی ایک نہ سنی
اور جھونپڑے تک اُسے لے گیا۔ میں نے بچوں سے پوچھا کہ اندر کون ہے۔
میری آواز سن کر اندر سے ایک جوان سا بنگالی نکلا۔ اس کے پیچھے ایک
ادھیڑ عمر آدمی باہر آیا۔ میں نے ان سے پوچھا، کون ہو تم؟ ہندو یا مسلمان؟

انہوں نے بتایا کہ وہ ہندو ہیں۔ میں نے بڑے رعب سے پوچھا۔ "مچھلی اور چاول ہے؟" — انہوں نے جواب دیا کہ دونوں چیزیں پکی ہوئی ہیں۔ ان لوگوں کی خوراک مچھلی اور چاول ہوتی ہے۔ میں نے حکم کے لہجے میں کہا — "ہم دونوں کے لئے لے آؤ۔ پانی بھی لانا۔ . . جلدی لاؤ"۔ وہ جلدی سے اندر چلے گئے۔ عائشہ نے پوچھا۔ "ہندو کا پکا کھاؤ گے؟" — میں نے جواب دیا۔ "جھٹکا تو نہیں ہے۔ یہ لوگ مچھلی اور چاول کھاتے ہیں"۔ . . .

"وہ ایک تھال میں اُبلے ہوئے چاول اور شوربے والی مچھلی ڈال لایا۔ ہم دونوں نے باہر بیٹھ کر تھالی خالی کر دی۔ سیر ہو کر پانی پیا۔ وہاں سے جب چلنے لگے تو مجھے یاد آ گیا کہ آموں کا موسم ہے۔ تالاب کے دوسری طرف میں نے آموں کے پیڑ دیکھ لئے تھے۔ میں نے ان بنگالیوں سے پوچھا کہ گھر میں آم ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ بہت ہیں۔ میں نے کہا جتنے ہیں لے آؤ۔ وہ ایک کپڑے میں کم و بیش دس سیر آم لے آیا۔ میں نے کپڑا ہاتھ میں لیا اور عائشہ سے کہا — "چلو" — بوڑھے بنگالی نے کہا — "پیسے نہیں دے گا؟" — میں نے اسے گھور کر دیکھا اور چھُرا دکھایا۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے اور جھونپڑے میں چلا گیا .... میرے جی میں آئی تھی کہ اس سارے کنبے کو چھرے سے ذبح کرتا جاؤں لیکن بچوں پر رحم آ گیا . . .

"ہم چل پڑے۔ دن گزرا۔ رات آئی۔ ہم ویرانے میں جا رہے تھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ سڑک پر جانے والے مہاجرین کا بہت قتلِ عام ہوا تھا ہم نے رات ایک ویران جگہ قیام کیا۔ عائشہ ذرا پرے لیٹی۔ میں نے اسے گھسیٹ کر قریب کر لیا۔ مجھے کوئی بدروح نظر نہیں آئی۔ اس کی جتنی خوشی عائشہ کو ہوئی اس کا اظہار اگلے دن کے سفر میں اُس کی چال اور انداز سے ہو رہا تھا۔ وہ مسلمان ہندوستان سے جانیں اور عصمتیں بچا کر اور عصمتیں لُٹا کر اور شدید زخمی ہو کر کیسی کیسی بُری حالت میں مشرقی پاکستان پہنچے تھے۔ کتنے ہزار، کتنے ہی لاکھ ہندوستان

میں ہی شہید ہو گئے تھے۔ میں جبل پور والے مسلمان پڑوسی گھرانے کی عورتوں کی چیخیں کبھی نہیں بھول سکتا جہاں ہندوؤں نے حملہ کیا تھا۔ اگر عائشہ مجھے وہاں سے نکال نہ لاتی تو ان چیخوں میں اُس کی بھی چیخیں شامل ہوتیں۔ پھر میں زندہ نہ ہوتا۔ اگر زندہ رہتا تو کسی پاگل خانے میں ہوتا .... میں اُس وقت کے واقعات آپ کو نہیں سنانا چاہتا جب ۴۷ء میں ہندوستان کے مسلمان مشرقی پاکستان میں داخل ہوئے تھے۔ وہ بڑے ہی دردناک واقعات تھے۔ آج بھی یاد آتے ہیں تو آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ صرف یہ بتا دینا اور تمام پاکستانیوں کو یاد دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم نے مشرقی پاکستان کی قیمت اس سے بہت زیادہ ادا کی تھی جو آپ نے مغربی پاکستان کے لئے دی تھی۔ یہ قیمت کاغذ کے نوٹوں اور چاندی کے سکوں کی صورت میں نہیں بلکہ خون کے دریاؤں کی صورت میں دی تھی اور اپنی پاکدامن بچیوں کی عصمتوں کی صورت میں دی تھی۔ . . .

"آیئے، میری کہانی سنیئے۔ یہ میری نہیں مشرقی پاکستان کی کہانی ہے... میرے پاس وہ تینوں چیزیں تھیں جن کے بل بوتے پر انسان پہاڑوں کے بھی جگر چاک کر سکتا ہے۔ ایک جرأت، دوسرا قومی جذبہ اور تیسرا پیسہ۔ میں اپنی فطری بزدلی ان چار ہندوؤں کے خون میں ڈبو آیا تھا جنہوں نے عائشہ کو بے آبرو کرنے کے لئے اُسے مجھ سے چھین لیا اور زمین پر گرا لیا تھا۔ اس سے پہلے میں نے ہندو کو کبھی دشمن نہیں سمجھا تھا۔ اس کافر نے جب مسلمانوں کا خون بہایا اور میں پاکستان میں داخل ہوا تو مجھ میں قومی جذبہ پیدا ہو گیا پھر پاکستان مجھے عائشہ کی عصمت سے زیادہ عزیز لگا۔

تر و تازہ ہو کر پھُدک رہی تھی۔ اُس رات کی یادگار میرا پہلا بچہ ہے جس کی عمر آج ستائیس سال ہے۔ اُس شام ہم اس جگہ سے مشرقی پاکستان کی سرحد میں داخل ہوئے جہاں ہلی واقع ہے۔ اس سے آگے بوگرا ہے۔ پچیس سال بعد میں اسی مقام سے فرار ہوا تھا۔

"یہ چوٹ تو ہر پاکستانی کے دل پر پڑی ہے کہ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا ہے مگر میرا جگر کٹ گیا ہے۔ میں نے جوش اور جذبے سے ۱۹۴۷ء میں اس دھرتی پر قدم رکھا تھا جو مشرقی پاکستان تھا۔ پچیس سال بعد یہ دھرتی میری دشمن ہو گئی اور پاکستان کی بجائے بنگلہ دیش بن گئی۔ دنیا بھر اسے بنگلہ دیش کہے، میری اپنی حکومت اسے بنگلہ دیش کہے، میں اسے مشرقی پاکستان ہی کہوں گا۔ اس دھرتی میں میری قوم کے بچوں کا، عورتوں کا، بوڑھوں اور جوانوں کا خون رچا ہوا ہے۔ بنگلہ بندھو اور ہندو اس پر قبضہ جمائے رکھیں۔ یہ دھرتی پاک رہے گی۔ معصوم شہیدوں کا لہو سر چڑھ کر بولے گا اور یہ سرزمین ایک بار پھر پاکستان بنے گی۔ وہ وقت شاید میں نہ دیکھ سکوں، آپ بھی نہ دیکھ سکیں، انشاء اللہ ہمارے بچے اور ان کے بچے دیکھیں گے....

"میں ان تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا کہ میری طرح کتنے ہزار، کتنے لاکھ پیسہ میرے پاس کافی تھا۔ میں مشرقی پاکستان سے واقف نہیں تھا۔ وہاں کی زبان بھی نہیں سمجھتا تھا، لیکن بنگالی اردو بول سکتے تھے۔ انہوں نے مجھے ڈھاکہ کے راستے پر ڈال دیا اور میں عائشہ کو ساتھ لئے ڈھاکہ چلا گیا۔ شہر ویران پڑا تھا۔ ہندو چلے گئے تھے یا مارے گئے یا بھاگ رہے تھے۔ ڈھاکہ میں ہندوؤں کی لاشیں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ کاروبار ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا۔ ان کے چلے جانے سے بازار خالی ہو گئے....

"مجھے ایک دکان مل گئی۔ مکان بھی مل گیا۔ عائشہ اس لئے بہت خوش تھی کہ میں بدل گیا تھا۔ مجھ میں وہ ساری خوبیاں پیدا ہو گئی تھیں جو ایک مرد میں ہونی چاہئیں۔ عائشہ کو غم تھا تو اپنے ماں باپ کا تھا۔ ان کے متعلق آج تک پتہ نہیں چلا کہ زندہ ہیں یا ہندوؤں کے ہاتھوں شہید ہو گئے تھے۔ مشرقی پاکستان سے اُن کے نام کئی خط لکھے تھے۔

کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ وہ شاید گاؤں میں شہید ہو گئے ہوں۔ عائشہ کے جب بچے پیدا ہوئے تو والدین کا غم کم ہو گیا..... مجھے خوشی اس بات پر تھی کہ مجھے ایک گھر اور اپنا وطن مل گیا تھا۔ میں تو دھتکارا ہوا بے گھر آدمی تھا۔ میں اپنی بیوی کا مفرور قاتل تھا۔ ہر لمحہ پھانسی کا رسہ میرے سر پر لٹکتا رہتا تھا۔ اب وہ خطرہ ختم ہو گیا تھا اور پہلی بیوی کی بد روح ہندوستان میں ہی رہ گئی تھی۔ عائشہ کبھی یاد دلاتی تھی تو بھی مجھے اس کی بد روح نظر نہیں آتی تھی۔ مجھ پر اب اُس کے قتل کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اب یہ عزم پیدا کر لیا کہ کاروبار کو پھیلاؤں گا اور اپنے ملک کے لئے کام کروں گا....

"دکان چھوٹی سی تھی، پیسہ کافی تھا۔ وقت گزرنے لگا۔ دکان جم گئی۔ میں نے پہلے روز سے ہی بنگالی زبان سیکھنی شروع کر دی تھی۔ میں نے اسے اپنے وطن کی زبان سمجھ کر پیار اور جذبے سے سیکھا۔ اس سے مجھے کاروبار میں بہت سہولت ملی۔ پانچویں سال میرا دوسرا بچہ پیدا ہوا۔ میں نے ایک دوست کو ساتھ ملا لیا، اور سپلائی کا کام شروع کر دیا۔ ایک سال کے عرصے میں میں درمیانہ درجے کا سپلائیر اور ٹھیکیدار بن گیا۔ پھر میں اس درجے سے اوپر نہ اُٹھ سکا کیونکہ بنگالیوں میں غیر بنگالیوں کے خلاف کچھ کچھ تعصب پیدا ہو گیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ہندو بھی کاروبار میں واپس آ گئے تھے۔ بنگالیوں کے تعصب کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ غیر بنگالیوں نے اپنے آپ کو بنگالی تہذیب و تمدن میں جذب کرنے کی بجائے الگ بستیاں آباد کرنی شروع کر دیں۔ بنگالی زبان کو پاکستانی زبان نہ سمجھا۔ آج بھی ایسے غیر بنگالی موجود ہیں جو پچیس سال مشرقی پاکستان میں رہے مگر بنگالی زبان سمجھ سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں۔ مجھ جیسے ایسے بھی ہیں جنہوں نے پہلے سال میں ہی بنگالی زبان بھی سیکھ لی اور بنگالی مسلمانوں میں گھل مل گئے مگر مجھ جیسوں کی تعداد تھوڑی تھی۔ اکثریت اُن مہاجرین کی تھی جو بنگالیوں کو اپنے مقابلے میں کمتر اور حقیر سمجھتے تھے۔ انہوں نے اُردو اور بنگلہ کے درمیان دیوار کھڑی کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم بنگالیوں کے لئے غیر ملکی بن گئے....

"اس تعصب کی دوسری وجہ ہندوؤں کی واپسی تھی۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ

ہندوستان نے ۱۹۷۱ء میں بنگالی مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملایا اور پاکستان پر قبضہ کیا ہے۔ ہندوستان کی حکومت نے اس ارادے سے ۱۹۴۸ء میں ہی ہندو تاجروں کو مشرقی پاکستان میں بھیج دیا تھا کہ بنگالی مسلمانوں کے ساتھ پہلا سا دوستانہ پیدا کر کے ان کے دلوں سے پاکستان کی محبت ختم کرنی ہے۔ ہندو تاجروں نے اس مشن کے لئے بہت کام کیا۔ وہ پہلے کی طرح بنگالی مسلمانوں میں گھل مل گئے اور ہندوستان سے آئے ہوئے مسلمان اپنے آپ کو بنگالیوں سے برتر اور افضل سمجھتے رہے اور جب مغربی پاکستان سے سرکاری ملازم مشرقی پاکستان میں گئے تو یوں لگتا تھا جیسے شہزادے آگئے ہیں۔ مغربی پاکستان کے وزیر جو مرکزی حکومت کے تھے، دورے پر آیا کرتے تھے۔ سرکاری طور پر اُن کے استقبال کے لئے جس طرح راستے اور بازار سجائے جاتے تھے، پتہ چلتا تھا جیسے برطانیہ کا شہنشاہِ معظم آ رہا ہے۔ پنجابیوں کا اور یو پی سے آئے ہوئے نفیس اور پر تکلف اُردو بولنے والے لوگوں کا رویہ ایسا ہوتا تھا جیسے وہ اس شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو مشرقی اور مغربی پاکستان پر حکومت کر رہا ہے۔ اب بنگالیوں پر یہ الزام عائد کرنا کہ انہوں نے ہندوؤں سے دوستی کر کے مسلمانوں کا قتل عام کیا، صحیح نہیں۔ اس کی ذمہ داری ہم سب پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے بنگالی مسلمانوں کے لئے ایسے حالات پیدا کئے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ دوستی کر کے ہم شہزادوں سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے......

"دو موقعے ایسے آئے ہیں جب بنگالی مسلمانوں نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ مسلمان ہیں، پاکستانی ہیں۔ مگر توجہ چاہتے ہیں۔ ایک موقعہ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کا تھا۔ قائدِ اعظمؒ کے انتقال کی اطلاع مشرقی پاکستان پہنچی۔ یقین کریں کہ گھر گھر سے، گلی گلی سے رونے اور چیخنے کی آوازیں آتی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے ہر کنبے میں ایک ایک بچہ مر گیا ہے جو ہر کسی کو عزیز تھا۔ مشرقی پاکستان کی ندیاں اور دریا بھی رو رہے تھے.....

دوسرا موقعہ جنرل اعظم خان کی برطرفی کا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جنرل اعظم خان کو ایوب خاں کی فوجی حکومت نے مشرقی پاکستان کا گورنر بنایا تھا۔ جنرل اعظم غیر بنگالی تھے لیکن

بنگالی انہیں اپنا پیر سمجھتے تھے۔ ان کی کرامات صرف یہ تھیں کہ وہ اپنے آپ کو بادشاہ اور بنگالیوں کو رعایا نہیں سمجھتے تھے۔ دیہاتی علاقے میں چلے جاتے اور کسانوں سے باتیں کرتے، ان کی سنتے اور ان کی مشکلات کا فوری علاج کرتے تھے۔ شہروں میں وہ عام لوگوں سے ملتے اور اُن کی زبانی ان کے مسائل سنتے۔ اُن کے دورِ حکومت میں طوفان آتے، تباہی مچی اور جانی نقصان ہوا۔ جنرل اعظم نے سمندری طوفان روکنے کا منصوبہ تیار کر لیا اور یہی اُن کا جرم تھا جس کی پاداش میں انہیں برطرف کر دیا گیا۔ مشرقی پاکستان میں ماتم کا ماحول پیدا ہو گیا۔ جنرل اعظم کی برطرفی کے خلاف جلوس نکلے۔ بنگالیوں نے نعرے لگائے "جنرل اعظم مت جاؤ۔ جنرل اعظم واپس آ جاؤ".....

"یہ اس پیار کا کرشمہ تھا جس کی توقع پوری نہ ہوئی۔ مشرقی پاکستان میں بھوک اور غربت بڑھتی گئی۔ سیلاب اور طوفان تباہی مچاتے رہے۔ لوگ ڈوب ڈوب کر مرتے رہے اور ہر تباہی کے بعد مغربی پاکستان سے جو مالی امداد آتی تھی اس کے چرچے سرکاری اخباروں اور ریڈیو سے اس انداز سے ہوتے تھے جیسے مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کو دل کھول کر خیرات دی ہے۔ مشرقی پاکستان کی زیادہ تر آبادی کسان تھی اور دیہات میں آباد تھی۔ وہ بدحالی اور فاقہ کشی کا شکار ہو رہی تھی اور ڈھاکہ شہر لندن اور پیرس بنتا جا رہا تھا۔ ڈھاکہ بادشاہوں کا شہر تھا۔ مغربی پاکستان کے بادشاہوں کے لئے یہ تفریحی شہر تھا۔ اس شہر سے جو ریڈیو بولتا تھا اس سے پتہ چلتا تھا کہ مشرقی پاکستان دنیا بھر میں سب سے زیادہ امیر اور خوشحال ملک ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستانی ریڈیو جس کا سٹیشن کلکتہ میں تھا، مشرقی پاکستان کا ہمدرد بن گیا۔ اس سٹیشن کی اتنی پاور تھی کہ تمام مشرقی پاکستان میں سنائی دیتا تھا۔ ہمارا اپنا ریڈیو سٹیشن ڈھاکہ کے اردگرد تھوڑے سے علاقے میں سنائی دیتا تھا۔ اور وہ صرف اپنی حکومت اور برسرِ اقتدار پارٹی کا پروپیگنڈہ کرتا رہتا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو پیار اور خلوص کے پیغام نشر کرتا اور بنگالیوں کے ذہن نشین کراتا تھا کہ انہیں بھوکا مارا جا رہا ہے، اور ان کی دولت مغربی پاکستان والے لوٹ کر لے جا رہے ہیں۔ اس پروپیگنڈے

کہ اُن ہندو تاجروں نے تقویت دی جو مشرقی پاکستان کی منڈی پر چھائے ہوئے تھے....

"اور پھر ہندوستان کے پروپیگنڈے کو ان پاکستانیوں نے تقویت دی جو سقوطِ مشرقی پاکستان تک اپنے آپ کو پنجابی، بہاری، یوپی والے مہاجر اور غیر بنگالی کہتے رہے۔ انہوں نے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی اور بنگالی مسلمانوں کے لئے اجنبی بنے رہے۔ ان کے قول اور فعل میں نفرت اور برتری تھی۔ ستمبر ۱۹۶۵ء تک ہندوستانی پروپیگنڈہ مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کی رگوں میں اُتر گیا تھا مگر وہاں جب یہ خبر پہنچی کہ ہندوستان نے مغربی پاکستان پر حملہ کر دیا ہے تو بنگالی مسلمان آگ کے شعلوں کی طرح بھڑک اٹھے۔ کلکتہ ریڈیو سٹیشن نے لاہور کی فتح کی وہی جھوٹی خبریں سنائیں جو ادھر آپ کو بھی سنائی گئی تھیں۔ بنگالیوں کی جذباتی حالت یہ تھی کہ چھ ستمبر کی رات ڈھاکہ میں شاید ہی کوئی بنگالی سویا ہو۔ دوسرے دن مصدقہ اطلاع آئی کہ لاہور فتح نہیں ہوا اور حملہ روک لیا گیا ہے۔ بنگالیوں نے خوشی کے جو نعرے لگائے ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے دلوں میں پاکستان کی محبت کتنی گہری اتری ہوئی ہے۔ انہوں نے ہندوستان کے پروپیگنڈے کو اعصاب سے جھٹک ڈالا تھا اور ایک لمحے میں سچے پاکستانی بن گئے تھے۔ جنگ کے دوران انہوں نے وہی قربانیاں دیں جو مغربی پاکستان والوں نے دی تھیں۔ یہ تیسرا موقع تھا جب مشرقی پاکستان کے بنگالیوں نے وفاداری اور حب الوطنی کا ثبوت دیا مگر جنگ ختم ہوئی تو بنگالیوں کو ہم نے پھر دھتکار دیا.....

"۱۹۶۵ء میں بنگالی مسلمانوں کا یہ جذبہ دیکھ کر ہندوستان نے اپنے پروپیگنڈے کا رنگ ڈھنگ بدل دیا۔ مشرقی پاکستان کے بعض بنگالی لیڈر ہندوستان کے زرخرید غلام بن گئے۔ ہندو مشرقی پاکستان کی رگوں میں اس طرح اتر گئے کہ سکولوں اور کالجوں میں ہندو ماسٹر، لیکچرار اور پروفیسر آگئے جن کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ غیر بنگالیوں نے بنگالیوں کے خلاف اجنبیت کو اور زیادہ اُبھارا اور وہ وقت آیا کہ بہاری، ایک الگ فرقے کے طور پر جانا پہچانا جانے لگا۔ بے شک بہاری کی اصطلاح تخلیق کرنے میں بنگالیوں اور ہندوؤں کا ہاتھ بھی تھا لیکن اس کے لئے زمین خود بہاریوں نے ہموار کی تھی جو الگ

فرقے کی حیثیت سے بنگالیوں سے الگ تھلگ رہے۔ پچیس برسوں میں وہ بہاری ہی رہے، پاکستانی یا مشرقی بنگالی نہ بنے۔ آگے چل کر بنگالیوں نے بہاری میں تمام غیر بنگالیوں کو شامل کر دیا۔ پنجابیوں کے خلاف بھی وہاں خوب نفرت پھیلائی گئی۔ ۱۹۷۰ء تک وہاں یہ حالت ہو گئی تھی کہ تجارت، سیاست، معاشرت، تعلیم اور ہر شعبے میں ہندو چھا گئے اور بنگالی ان کے حسن سلوک سے اس قدر متاثر تھے کہ ان کی فریب کاری کو سمجھ ہی نہ سکے۔ حادثہ یہ ہوا کہ ہماری حکومت نے بھی آنکھیں اور کان بند رکھے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی اور نہ غیر بنگالیوں نے جنہیں بہاری کہا جاتا تھا، اپنا رویہ بدلا۔ مگر اب رویے بدلنے کا وقت گزر چکا تھا۔ مشرقی پاکستان کا سودا ہو چکا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے سمندری طوفان نے تباہی بپا کی اس کا الزام مغربی پاکستان کے سر تھوپا گیا۔ ہندوؤں نے اسے اپنے حق میں اور مغربی پاکستان کے خلاف نہایت چابکدستی اور کامیابی سے استعمال کیا۔ انتخابات اس وقت لڑے گئے جب لاشیں ابھی دفن نہیں ہوئی تھیں۔ خلیج بنگال میں بنگالی مسلمانوں کی لاشیں تیر رہی تھیں۔ سارا مشرقی پاکستان صرف سوگوار ہی نہیں تھا بلکہ بھڑکا ہوا تھا.....

"انتخابات کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ یہ جیت عوامی لیگ یا شیخ مجیب کی نہیں تھی، یہ ہندوستان کی فتح تھی۔ مجیب کی کامیابی کے فوراً بعد بنگالی مسلمان غیر بنگالی کا کھلم کھلا دشمن ہو گیا۔ اُس وقت تک میرا کاروبار خاصا پھیل چکا تھا۔ میرا پہلا بچہ جو بیس سال کا، دوسرا انیس سال کا، لڑکی پندرہ سال کی اور اس سے چھوٹی لڑکی آٹھ سال کی ہو چکی تھی۔ بڑے لڑکے کی شادی کئے آٹھ مہینے ہو گئے تھے۔ ملک کے حالات بالکل اسی قسم کے ہو گئے تھے جس قسم کے ہندوستان میں ۱۹۴۷ء میں ہوئے تھے۔ فرق یہ تھا کہ ہندوستان میں ہندو مسلمان کا دشمن ہو گیا تھا اور مشرقی پاکستان میں مسلمان مسلمان کا دشمن ہو گیا تھا۔ بازاروں میں، محلوں میں اور ہر جگہ ہمیں نئے نئے لوگ نظر آنے لگے تھے جن کے متعلق پتہ چلا کہ ہندو ہیں اور نئے نئے ہندوستان سے آئے ہیں۔ ان کی چال ڈھال عام بنگالیوں سے مختلف

تھی۔ یہ دراصل ہندوستان کے گوریلے اور کمانڈو تھے جن کے متعلق آپ نے پہلے بھی سنا ہو گا کہ شہریوں کے لباس میں ہزاروں کی تعداد میں مشرقی پاکستان میں داخل کئے گئے تھے۔ یہ مکتی باہنی کا حصّہ تھے۔ بنگالی مسلمانوں کو ہزاروں کی تعداد میں ہندوستان میں گوریلا ٹریننگ دی گئی تھی۔ ۱۹۷۱ء کا آغاز بڑا ہی منحوس تھا۔ ہمیں بنگالیوں نے دھمکیاں دینی شروع کر دیں۔ ہم اسی وقت سمجھ گئے تھے کہ مشرقی پاکستان ہاتھ سے نکل گیا ہے......

"بنگالی مسلمانوں میں اچھے لوگ بھی تھے اور کچھ تو بہت ہی اچھے تھے۔ بازار میں ہم اکٹھے ہوتے تھے مگر ہم نے اپنی بستیاں الگ بسا رکھی تھیں۔ وہاں ہمارا بنگالیوں کے ساتھ میل جول نہیں ہوتا تھا۔ ان غیر بنگالی بستیوں کو بنگالی بنگلہ دیش میں پاکستان کہنے لگے۔ ایک روز میرے ایک بنگالی دوست نے مجھے کہا — "رئیس بھائی! سنو۔ مغربی پاکستان میں تمہارا کوئی عزیز رشتہ دار ہے تو بال بچوں کو وہاں بھیج دو حالات سخت خراب ہیں۔ اس وقت مشرقی پاکستان ہندوؤں کے قبضے میں ہے۔ یہاں بہت خون خرابہ ہو گا۔ کوئی بہاری (غیر بنگالی) زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ تمہاری بستیوں کو جلا دیا جائے گا — میں نے اُسے بتایا کہ مغربی پاکستان میں میرا کوئی نہیں ہے۔ اس نے کہا — "پھر تم کسی اور سے مشورہ نہ لینا کہ تمہیں کیا کرنا چاہیئے۔ میں جب بھی تمہیں کہوں کہ اپنے خاندان کو میرے گھر لے آؤ تو فوراً انہیں لے آنا — میرے چار بنگالی ملازم تھے۔ ایک کلرک تھا۔ ایک آرڈرلا تھا اور دو چپڑاسی یا مزدور تھے۔ یہ سترہ اٹھارہ سالوں سے میرے پاس تھے۔ میں نے انہیں بچوں کی طرح رکھا ہُوا تھا۔ ان میں سے صرف ایک کلرک نمک حرام نکلا۔ باقی تینوں نے مجھے وہی مشورہ دیا کہ وہ میرے بال بچوں کو اپنی پناہ میں رکھیں گے اور ان کی حفاظت کریں گے۔ اُس وقت کشیدگی اتنی بڑھ گئی تھی کہ کسی بنگالی پر بھروسہ کرنا خودکشی کے برابر تھا لیکن میں نے ان پر بھروسہ کیا......

"عائشہ نے اور میں نے اپنے دونوں بیٹوں کو جرأت مند بنا رکھا تھا۔

ان میں قومی جذبہ پیدا کر رکھا تھا اور سب سے بڑا وصف جو میں نے ان میں پیدا کیا تھا وہ تھا پاکستان کا پیار اور ہندو سے نفرت۔ میں انہیں ۱۹۴۷ء کے واقعات سناتا رہتا تھا۔ جو ضروری باتیں انہیں سکولوں میں بتائی جانی چاہیئے تھیں مگر نہیں بتائی گئی تھیں وہ میں نے انہیں از بر کرا دی تھیں۔ میں نے مشرقی پاکستان میں داخل ہونے تک کی جو آپ بیتی آپ کو سنائی ہے وہ میں نے اپنے بچوں کو بچپن میں ہی سنا دی تھی۔ میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں نے اپنی پہلی بیوی کو کب، کیوں اور کس طرح قتل کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے پہلے بچے کو جب سنایا تھا کہ میں نے اپنی پہلی بیوی کو قتل کیا تھا تو اُس وقت اس کی عمر تیرہ سال تھی۔ عائشہ سن رہی تھی۔ اس نے کہا تھا — "اسے بھی سبق دو کہ ایک بیوی کو قتل کرو اور دوسری بیوی لے آؤ۔ پھر اسے قتل کرو اور تیسری لے آؤ"۔ یہ مذاق تھا۔ لیکن میں نے اپنے بچوں کو باری باری قتل کی کہانی سنا کر یہ بھی ذہن نشین کرایا تھا کہ کس کا قتل جائز اور کس کا گناہ ہے۔ میں نے بدکردار عورت اور ہندو کے قتل کو جائز قرار دیا تھا۔ اپنے دونوں لڑکوں کو میں نے خوب دلیر بنا دیا تھا۔ جنوری ۱۹۷۱ء میں دونوں کو ایک ایک ریوالور بلا لائسنس لا دیا تھا۔ جس لڑکی کی عمر پندرہ سال ہو گئی تھی اسے میں نے چپ چاپ اور ڈرپوک لڑکی نہیں بننے دیا تھا۔ عائشہ نے اسے اپنا واقعہ سنایا تھا مگر جب یہ خیال آتا تھا کہ میں اپنی اولاد کو مسلمانوں کے خلاف تیار کر رہا ہوں تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میری پاکستانیت کا کیا حشر ہوتا تھا۔ مگر حالات کی کروٹ ہی کچھ ایسی تھی......

"وہ وقت اس طرح تیزی سے آ گیا جس طرح مشرقی پاکستان میں سمندری طوفان اچانک آ جایا کرتے ہیں۔ ہمیں اس انکشاف نے حیران کر دیا کہ بنگالی مسلمان اس قدر درندہ ہوتا ہے۔ میں آپ کو سنا نہیں سکتا کہ انہوں نے دودھ پینے کی عمر کے بچوں کو کس طرح قتل کیا۔ زندہ معصوم بچوں کی گردنوں میں کیل ٹھونک کر درخت کے تنے سے لٹکا دیا اور بچے کس طرح تڑپ تڑپ کر مرے۔ آٹھ آٹھ، نو نو سال کی بچیوں کی انہوں نے آبروریزی کی۔ مسجدوں میں عورتوں کو اکٹھا کر کے انہیں بے آبرو کیا اور

قتل کر دیا۔ غیر بنگالی کنبوں کو یہ جھانسہ دے کر ڈھاکہ یونیورسٹی کے ہال میں جمع کر لیا کہ وہاں وہ محفوظ رہیں گے۔ جب ہال بھر گیا تو ہر طرف سے اس بدقسمت ہجوم پر مشین گنوں کا فائر کھول دیا۔۔۔۔ میں آپ سے معذرت چاہوں گا کہ میں یہ تفصیلات نہیں بتا سکتا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔۔۔۔

" اس لرزا دینے والے ظلم کے باوجود میں یہ ضرور کہوں گا کہ علیحدگی پسند بنگالی نہیں تھے۔ ہم تھے۔ ہم سے مراد وہ مہاجرین ہیں جو ہندوستان سے مشرقی پاکستان میں جا کر آباد ہوئے تھے۔ میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ ان کا رویہ وہاں کیا رہا۔ اس کے علاوہ پاکستان کے بادشاہوں اور وزیروں کا رویہ کیا رہا۔ اب بنگالی ہمیں ہتھیاروں کی زبان میں کہہ رہا تھا۔ "تم اگر ہم میں سے نہیں ہو تو یہاں سے نکل جاؤ"۔ ہم اس کے سر پر سوار رہے تو اس نے ہندو کی مدد حاصل کر کے ہمیں نہ وہاں کا چھوڑا نہ یہاں کا۔۔

"غیر بنگالی مہاجرین نے جو الگ بستیاں آباد کی تھیں انہیں بنگالیوں نے گھیرے میں لے لیا۔ بجلی بند کی، پانی بند کیا، راشن بند کیا، پھر حملہ کیا، لڑکیاں اغوا کیں، لوٹ مار کی اور ہر طرح کی درندگی کا مظاہرہ کیا، لیکن میں آپ کو اُن بنگالیوں سے روشناس کرانا چاہتا ہوں جنہوں نے غیر بنگالیوں کو پناہ میں لے لیا اور ان کے لئے اپنی جانیں خطرے میں ڈالی تھیں۔ ان میں میرا وہ دوست تھا جس نے سب سے پہلے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں اہل و عیال کو مغربی پاکستان بھیج دوں۔ قتلِ عام سے دو روز پہلے اُس نے صبح صبح مجھے کہا کہ میں بنک سے تمام رقم نکلوا لوں اور سارے کنبے کو اس کے گھر بھیج دوں۔ اُسی روز میں تمام رقم کا چیک لکھ کر بنک میں گیا۔ وہاں مجھ سے پوچھا گیا کہ میں بنگالی ہوں یا بہاری۔ میں نے بتایا کہ میں پاکستانی ہوں۔ یہ باتیں بنگالی زبان میں ہو رہی تھیں۔ کلرک نے پوچھا "تم بنگالی ہو یا پاکستانی؟ تم کدھر پیدا ہوئے تھے؟" میں نے اسے بتا دیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے مینجر نے اپنے دفتر میں بلایا اور صرف دس ہزار روپیہ مجھے دے کر کہا "یہ لے جاؤ اور زیادہ بات مت کرنا"۔ میں نے اُسے کہا کہ یہ چیک مجھے دے دو۔ میں دس ہزار کا چیک لکھ دیتا ہوں۔ اس کے چپڑاسی نے جانے کہاں سے خنجر نکالا اور صرف اتنا

کہا "نکل جاؤ اِدھر سے"۔ میں دس ہزار روپیہ لے کر اور چھیاسٹھ ہزار روپیہ بنک میں بنگالی مینجر کی جیب میں چھوڑ کر نکل گیا۔۔۔۔

" اپنے دکان نما دفتر میں گیا تو میں نے کلرک کو بتا دیا کہ میرے ساتھ کیا سلوک ہُوا ہے۔ میں اِدھر اُدھر کام کاج میں باہر مصروف ہو گیا۔ واپس آیا تو دوسرے کمرے میں ہنگامہ بپا تھا۔ جا کر دیکھا تو میرے کلرک کی پٹائی ہو رہی تھی۔ میرے تین ملازم اُسے بُری طرح پیٹ رہے تھے۔ میں نے اسے چھڑایا تو دوڑتا ہُوا وہ باہر نکل گیا۔ ملازموں نے مجھے بتایا کہ وہ انہیں میرے خلاف اکسا رہا تھا اور کہہ رہا کہ اس سے دس ہزار روپیہ چھین لو اور اس کی بیٹی (جس کی عمر پندرہ سال تھی) اور میرے بڑے بیٹے کی بیوی کو اغوا کر کے باقی سب کو قتل کر دو۔۔۔۔ میرے یہ تین ملازم بھی بنگالی ہی تھے۔ انہوں نے اسے پیٹ ڈالا اور اُسی شام تینوں میرے گھر آئے اور کہا "آپ بڑے خطرناک علاقے میں رہتے ہیں۔ یہاں کی تو اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ یہاں سے نکلیں"۔ میں تمام عمر اپنے اس بنگالی دوست کا اور اپنے ان تین بنگالی ملازموں کا احسان نہیں بھول سکوں گا جنہوں نے میرے کنبے کی جان اور عزّت کی حفاظت اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر کی۔ انہوں نے آپس میں طے کیا کہ میرے خاندان کو میرا دوست اپنے گھر لے جائیگا اور میرے ملازم ان کی حفاظت کے لئے رات وہیں سویا کریں گے۔ اُسی رات کو میرا خاندان میرے دوست کے گھر منتقل ہو گیا۔ زیورات، نقدی اور کپڑے ساتھ رکھے۔ باقی سامان گھر میں بند کر دیا۔۔۔۔

" قتلِ عام شروع ہو گیا۔ بنگالی مسلمانوں نے ۱۹۴۷ء کے ہندوؤں کو مات کر دیا۔ ہماری فوج بارکوں میں بند تھی۔ میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ فوج چھاؤنیوں میں کیوں قید رہی اور غیر بنگالیوں کا قتلِ عام روکنے کے لئے اسے باہر کیوں نہ نکالا گیا۔ قتلِ عام، آتش زنی اور آبرو ریزی منظم تھی۔ یہ پلان ایک مدت سے تیار ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ بنگالی اپنے مکانوں کو مورچے بنا رہے تھے جیسے وہ بہت بڑی جنگ کی تیاری کر رہے ہوں۔ وہاں اب کوئی قانون نہیں

تھا۔ کوئی پولیس نہیں تھی اور کوئی فوج نہیں تھی۔ گولیوں کے دھماکے تھے، عورتوں اور بچوں کی چیخیں تھیں۔ آگ اور لاشیں تھیں۔ مسجدوں کی ایسی بے حرمتی ہوئی کہ کوئی مسلمان بیان نہیں کر سکتا۔ البتہ گرجے اور مندر ہر طرح سے محفوظ رہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قتلِ عام اور بربریت کی باگ دوڑ کس کے ہاتھ تھی......

"ایک روز میں اپنے دوست کے گھر میں تھا۔ میرا پورا کنبہ وہیں تھا۔ میرے دو ملازم باہر بیٹھے تھے۔ باہر مجھے اونچی اونچی باتوں کی آوازیں سنائی دیں۔ کوئی جھگڑا ہو رہا تھا۔ میں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ دس بارہ بنگالی مختلف ہتھیاروں سے مسلح میرے ملازموں کے ساتھ جھگڑ رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اس گھر سے بہاریوں کو باہر نکالو یا۔ بنگالی یہاں سے نکل جاؤ۔ میرا دوست باہر نکلا۔ اُسے بھی بنگالیوں نے یہی الٹی میٹم دیا۔ اس نے انہیں دوستانہ طریقے سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی مگر اُن کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔

میرے ملازموں کے پاس قصابوں والے بڑے سائز کے چھُرے تھے۔ اندر میرے دونوں بیٹے ریوالور بھر کر تیار ہو گئے۔ میرے دوست کی شکاری بندوق تھی جو ضرورت کے لئے ہم اپنے پاس رکھتے تھے۔ میں نے اس بندوق کی دونوں نالیوں میں کارتوس ڈال لئے۔ میں اب جوان نہیں تھا۔ عمر پچپن سال ہو گئی تھی۔ جذبات جلدی غالب آجاتے تھے۔ باہر بحث مباحثہ اور زبانی جھگڑا جاری تھا۔

میں نے جونہی بندوق کی نالیوں میں کارتوس ڈالے میرے آنسو نکل آئے۔ اگر باہر کھڑے بنگالی ہندو ہوتے تو میری آنکھوں سے آنسو نہ نکلتے، میری بندوق سے گولیاں نکلتیں مگر وہ مسلمان تھے، پاکستانی تھے۔ آنسو بھی ایسے آئے کہ میری سسکیاں نکل گئیں۔ میں، میرے بیٹے، میرا دوست، اس کا جوان بیٹا اور میرے دو ملازم ان دس بارہ بنگالیوں کو دوستانہ طریقے سے اندر بلا کر انہیں ختم کر سکتے تھے۔ پکڑے جانے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔ رات کو ہم ان کی لاشیں سڑک پر پھینک دیتے۔ وہ تو اب لاشوں کا دیس تھا۔ دس بارہ لاشوں کا اضافہ کسی کو محسوس بھی نہ ہوتا۔ لیکن وہ مسلمان تھے۔ میں ان پر گولی نہیں چلا سکتا تھا......

"میرے بڑے بیٹے نے مجھے طنزیہ کہا ——— "ابا جان! آپ تو کہا کرتے تھے

کہ میں اب بزدل نہیں رہا۔ آپ عورتوں کی طرح رو رہے ہیں" ——— میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ بندوق ہاتھ میں رکھی اور باہر چلا گیا۔ وہ میرے جسم اور قدبُت سے جان گئے کہ یہ شخص بنگالی نہیں، بہاری بھی نہیں، یہ پنجابی یا پٹھان ہے۔ ایک نے اردو زبان میں مجھے کہا ——— "تم اپنا بال بچہ بنگالی کے گھر سے باہر نکالو" ——— میرے جذبات اُبلے ہوئے تھے۔ وہ عجیب سی کیفیت تھی جس میں ہذیان کا رنگ بھی تھا۔ میں نے بنگالی زبان میں بولنا شروع کر دیا۔ الفاظ زبان سے بہے جا رہے تھے۔ معلوم نہیں یہ الفاظ کہاں سے آ رہے تھے۔ میں انہیں وعظ یا لکچر نہیں دے رہا تھا۔ میں اُن سے جان بخشی کی التجا نہیں کر رہا تھا۔ میں انہیں شرم دلا رہا تھا۔ انہیں یاد دلا رہا تھا کہ وہ مسلمان ہیں۔ میرے ہونٹوں سے جھاگ پھوٹ رہی تھی۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ اگر انہوں نے اس گھر پر حملہ کیا تو ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا۔ پھر میں نے انہیں بتایا کہ ہندو کیا ہے، اس کی اصلیت اور ذہنیت کیا ہے۔ عجیب بات ہے کہ وہ سب خاموش رہے۔ وہ نیم دائرے میں کھڑے تھے۔ میں نے پہلے آدمی سے پوچھا "تم مسلمان ہو؟" ——— اس نے جواب دیا "ہاں" ——— یہی سوال دوسرے سے پھر تیسرے سے پوچھا۔ سب نے کہا "ہاں"۔ چوتھا خاموش رہا۔ میں نے کہا "تم ہندو ہو" ——— اس نے دھمکی آمیز لہجے میں جواب دیا ——— "ہاں میں ہندو ہوں" ——— میں نے باقی سب سے پوچھا ——— "اور کوئی ہندو ہے؟" ——— معلوم ہوا یہ اکیلا ہندو ہے۔ اُس کے ہاتھ میں بنگال کا مخصوص ہتھیار دہا تھا۔ مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔ میں نے نہیں سوچا کہ اس ہندو کے دس بارہ ساتھی میرا کیا حال کر دیں گے۔ جونہی اس نے کہا، ہاں میں ہندو ہوں، میں نے بندوق دائیں سے بائیں ہاتھ میں لے کر اس ہندو کے منہ پر دائیں ہاتھ کا ایسا گھونسہ جمایا کہ وہ آٹھ دس قدم پیچھے کو گرا۔ اس کا دہا اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا۔ وہ بہت تیزی سے اُٹھا اور اپنے ہتھیار کی طرف لپکا۔ اندر سے ریوالور کی ایک گولی فائر ہوئی۔ ہندو ایک بار اوپر کو ہوا اور پھر ایسا گرا کہ اُٹھ نہ سکا۔ یہ گولی میرے دوست کے بیٹے نے چلائی تھی۔ یہ نوجوان اور میرے دونوں بیٹے ریوالور لئے مکان کی کھڑکیوں میں پردوں کے پیچھے تیار کھڑے تھے تاکہ بنگالی

گڑبڑ کریں تو وہ فائر کھول دیں ......

"اس گولی سے میں لرز گیا کیونکہ اس کا نتیجہ لڑائی تھا، لیکن اسے میں معجزہ کہوں گا کہ بنگالیوں کے اس مسلح گروہ میں ذرہ بھر حرکت نہ ہوئی۔ کیا وہ ہم سے ڈر گئے تھے؟ کیا میری جذباتی اور ہذیانی باتوں نے انہیں رام کر لیا تھا؟ —— خدا بہتر جانتا ہے مجھے یہ شک ہے کہ میں نے ان کے دلوں میں ایمان کی رمق پیدا کر دی تھی۔ میرا دوست ان سے مخاطب ہوا اور انہیں کہا کہ وہ اندر چلیں۔ وہ اندر آ گئے۔ انہوں نے زیادہ باتیں نہیں کیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ قتل و غارت کے طوفان میں اڑے جا رہے ہیں اور انہیں کچھ خبر نہیں کہ وہ کیوں غیر بنگالیوں کو قتل کرتے پھر رہے ہیں۔ ایک رَو چلی اور وہ بھی اس رَو میں بہ نکلے۔ ان میں سے ایک نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنی حفاظت کا اور زیادہ بندوبست کر لوں۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس طرف کا رُخ نہیں کریں گے۔ انہوں نے غارت گری کی بڑی ہی ہولناک باتیں بتائیں ..... وہ دوستانہ طریقے سے ہاتھ ملا کر چلے گئے اور انہوں نے یہ کرم بھی کیا کہ ہندو کی لاش کو گھسیٹ کر لے گئے ......

"یہ گروہ تو چلا گیا لیکن ہمارے لئے یہ بھیانک خطرہ چھوڑ گیا کہ بنگالی دوست کے گھر میں ہماری موجودگی کی خبر باہر پھیل گئی تھی۔ اس کا انتظام ہم نے یہ کیا کہ رات کو ہم سارے مرد باری باری پہرہ دیتے تھے، لیکن ہمیں صرف دو راتیں پہرہ دینا پڑا۔ تیسری رات پورے ایک بجے شہر میں بڑا ہی ہولناک دھماکہ ہوا اور اس کے فوراً بعد اس قدر فائرنگ اور ٹینکوں کی گولا باری شروع ہو گئی کہ جگر پھٹے جا رہے تھے۔ صبح ہوئی تو ہم نے ہر طرف پاک فوج کے جوانوں اور افسروں کو بھاگتے دوڑتے دیکھا یہ ۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کی صبح تھی۔ گزشتہ رات فوج نے جوابی کارروائی شروع کر دی تھی دھماکوں کے سوا کچھ سُنائی نہ دیتا تھا۔ کارروائی تین مہینے لیٹ شروع کی گئی۔ بنگالی اپنا کام کر چکے تھے۔ ہندوستان کی فوج کے کمانڈو جن کی تعداد پچاس سے اسّی ہزار کے درمیان بتائی گئی تھی، مشرقی پاکستان میں داخل ہو کر موزوں جگہوں پر مورچہ بند ہو گئے اور پھیل بھی گئے تھے۔ ہماری فوج کو اتنی دیر سے کارروائی کر کے اسے بڑی ہی سخت

مشکل میں ڈال دیا گیا تھا۔ ہمیں یہ فائدہ ہوا کہ ہم نڈر ہو کر باہر پھرنے لگے اور اپنے کاروبار کی طرف توجہ دینے کے قابل ہو گئے۔ ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر طیارے اترتے تھے اور فوج کو اتار کر واپس چلے جاتے تھے۔ اس سے امید بندھی تھی کہ مشرقی پاکستان بچ جائے گا، مگر حالات بگڑتے چلے گئے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ فوج کو راشن اور اُن دیگر اشیاء کی سپلائی نہیں مل رہی جو فوج کو ٹھیکیدار سپلائی کیا کرتے تھے۔ زیادہ تر بڑی بڑی ٹھیکیداریاں بنگالیوں کے پاس تھیں۔ انہوں نے فوج کی سپلائی بند کر دی۔ پنجابی دکانداروں اور ٹھیکیداروں کو پتہ چلا تو یہ کام انہوں نے سنبھال لیا مگر بازار سے یا دیہات سے اشیاء خریدنا اور اکٹھی کرنا بعض اوقات ناممکن ہو جاتا تھا۔ جہاں کسی بنگالی کو پتہ چل جاتا تھا کہ یہ چیزیں فوج کے لئے جا رہی ہیں، وہ دینے سے انکار کر دیتا تھا۔ تاہم پنجابی اور دیگر غیر بنگالی ٹھیکیدار ان دشواریوں میں چیزیں اکٹھی کر کے فوج کو سپلائی کر دیتے تھے ......

"میرا کام سپلائی کا ہی تھا۔ فوج کو میں نے صرف ایک بار ان ہنگاموں سے پہلے ایک آرڈر سپلائی کیا تھا۔ اس لئے مجھے فوجی سپلائی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ لیکن مجھے فوج کی مدد ہر قیمت پر بلکہ اپنی جان دے کر بھی کرنی تھی۔ میں ڈھاکہ میں فوجی ہیڈ کوارٹر میں چلا گیا اور اپنی خدمات پیش کیں۔ ایک میجر سے بات ہوئی تو اس بے چارے نے اس طرح سکون کا سانس لیا جیسے اس کا بڑا ہی ٹیڑھا مسئلہ حل ہو گیا ہو۔ اُس نے بتایا کہ چند ایک غیر بنگالی ٹھیکیدار ضروریات پوری کر رہے ہیں، لیکن وہ مشکل بیس فیصد سامان لاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ باہر سے مال ملتا نہیں ...... اُس نے آرڈر دینے کا دفتری طریقہ اختیار کئے بغیر مجھے اشیاء کی فہرست دے دی اور قدرے مایوسی کے لہجے میں کہا ــ "حالات ایسے ہیں کہ ایک روپے کی چیز کے آپ ہم سے دس روپے بھی وصول کر سکتے ہیں۔ ہم ادا کریں گے۔ کوشش کیجئے گا کہ آپ ہماری مجبوری سے فائدہ نہ اٹھائیں" ــ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ فہرست لے کر چلا گیا۔ میں نے تقریباً ایک مہینے سے اپنا گودام نہیں دیکھا تھا، نہ دکان کھولی تھی۔

یہ عرصہ میں اپنے دوست کے گھر پناہ گزین رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بنگالیوں نے گودام لوٹ لیا ہوگا۔ اب وہاں فوج کی وجہ سے خطرہ کم ہو گیا تھا۔ رات کے وقت خطرہ ہوتا تھا۔ میں نے اپنے بنگالی دوست، دونوں بیٹوں اور تینوں ملازموں کو ساتھ لیا اور گودام دیکھنے گئے۔ اللہ کی شان دیکھئے کہ گودام کو کسی نے چھوا تک نہیں تھا۔ اس کی ایک وجہ تھی کہ یہ ایسی جگہ تھا جہاں کوئی واقف ہی جان سکتا تھا کہ یہ گودام ہے۔ آرڈر کی آدھی اشیاء تو یہیں سے پوری ہو گئیں۔ باقی اپنے دوست اور ملازموں کی کوشش سے فراہم کیں اور فوجی ہیڈکوارٹر میں پہنچا دیں۔ وہاں کے فوجی افسر میرا بل دیکھ کر حیران ہوئے کیونکہ میرے نرخ نارمل حالات سے بھی کم تھے۔ وجہ یہ تھی کہ میں نے منافع بالکل نہیں لیا تھا...

"سپلائی کا سلسلہ چل پڑا۔ میں اس کی زیادہ تفصیل نہیں سناؤں گا کیوں کہ آپ کہیں گے کہ میں ہیرو بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں کسی پہلو سے ہیرو نہیں ہوں۔ وہاں میں اکیلا نہیں تھا۔ کئی اور پنجابی سپلائیر تھے۔ ان میں سے بعض کو قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ سپلائی حاصل کرنے کے لئے ان کے لیے بنگالیوں نے دشواریاں پیدا کیں۔ رات کے وقت ان پہ فائرنگ بھی ہوئی، لیکن انہوں نے فوج کی ضروریات پوری کیں۔ مجھے مشرقی پاکستان سے آنے والے تین چار حضرات نے بتایا ہے کہ جب فوج نے ہتھیار ڈالے تو اُن ٹھیکیداروں میں سے جو مکتی باہنی کے ہاتھ چڑھ گئے تھے انہیں بڑی ہی اذیت ناک موت مارا گیا تھا۔ ان میں بعض گرفتار ہو گئے تھے اور بھارت کے قیدی بنے اور کچھ ایسے بھی تھے جو میری طرح فرار ہوئے تھے...... انہوں نے مشرقی پاکستان میں پھیلی ہوئی پاک فوج کو ان حالات میں بھی سامان سپلائی کیا تھا جب فضا میں ہندوستان کے لڑاکا بمبار طیارے اور زمین پر اُس کی فوجیں دندنا رہی تھیں۔ انہوں نے جو مالی نقصان اٹھایا وہ ایک الگ داستان ہے....

"میں نے ڈھاکے کے اردگرد فوجی یونٹوں کو بھی سامان پہنچایا۔ ایک رات میں ڈھاکہ سے پندرہ سولہ میل دور ایک جگہ ٹرک کے ذریعے سامان پہنچانے جا رہا تھا۔ یہ نومبر کے وسط کا واقعہ ہے۔ ڈرائیور پٹھان تھا۔ میں اُس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ پیچھے

ٹرک میں میرے دونوں بیٹے ایک بنگالی ملازم اور میرے دوست کا بیٹا تھا۔ اُس وقت تک حالات بہت زیادہ بگڑ چکے تھے۔ مکتی باہنی اور ہندوستان کے کمانڈو بہت سرگرم ہو گئے تھے۔ ٹرک شہر سے نکلا تو میں نے اس کی روشنی میں سڑک پہ چار بنگالی اکٹھے کھڑے دیکھے۔ ٹرک قریب گیا تو اُن کم بختوں کی یہ دلیری کہ یہ بھی نہ سوچا کہ یہ فوجی ٹرک ہوگا اور اس میں فوجی ہوں گے انہوں نے سٹین گنیں کندھوں سے لگا لیں۔ یہ دلیری نہیں بیوقوفی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ گاڑی روکنا نہیں۔ لڑکوں کو خبردار کر دیا۔ انہوں نے سامان پر کھڑے ہو کر ٹرک کے اوپر سے ریوالور فائر کرنے شروع کر دیئے۔ ان کی فائرنگ خاصی تیز تھی۔ پٹھان نے ٹرک کی رفتار تیز کر دی۔ ریوالوروں کی تمام گولیاں خطا گئیں۔ فائدہ صرف یہ ہوا کہ بنگالی گھبرا کر بھاگے۔ لڑکوں نے دائیں بائیں بھی فائر کیا۔ ٹرک وہاں سے نکل گیا، لیکن پیچھے سے بنگالیوں نے فائرنگ کی۔ سٹین گن اتنی دور تک مار نہیں کر سکتی۔ مجھے لڑکوں کا فکر تھا۔ ہم منزل پر پہنچ گئے۔ پیچھے چاروں لڑکے سلامت تھے۔ کچھ گولیاں ٹرک کی سائیڈ پہ لگی تھیں، لیکن کوئی نقصان نہیں ہوا۔ فوجیوں نے ہمیں رات کو واپس نہ آنے دیا۔ ہم اگلی صبح واپس آئے....

"اسی طرح ہم کئی بار خطروں میں گھر گئے اور دلیری سے نکل گئے۔ ہم پر کئی بار گولیاں چلیں۔ میرے بنگالی دوست نے سامان خریدنے میں بہت مدد دی۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ میں اس بنگالی کا نام کیوں نہیں بتاتا۔ نام چھپانے کی وجہ یہ ہے کہ ہو سکتا ہے شیخ مجیب کے غنڈوں کو علم ہو جائے۔ وہ اب بھی اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے انہوں نے ۱۷ دسمبر کے فوراً بعد شہید کر دیا ہو۔ وہ محب وطن پاکستانی تھا۔ میرے تین ملازموں کو بھی میرے نمک حرام کلرک کی نشاندہی پہ شہید کر دیا گیا ہوگا۔ پاکستان کی تاریخ میں ان گمنام پاکستانیوں کا نام نہیں آئے گا۔ لیکن ان کا خون ضائع بھی نہیں جائے گا۔ ان بنگالیوں نے اُس وقت بھی میرا ساتھ دیا جب نومبر کے آخر میں انڈیا نے مشرقی پاکستان کی سرحدوں پہ حملہ کر دیا اور قدم قدم پر مکتی باہنی کا خطرہ تھا۔ ہم راشن اور دیگر اشیاء کسی نہ کسی طرح حاصل کر کے فوج کو سپلائی کرتے رہے اور ۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کی

صبح باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں کہ میں ہندوستان کے طیاروں کے حملے اور پاکستان کے ہوا بازوں کے مقابلے پوری طرح آپ کو سناؤں تو کم از کم چوبیس گھنٹے میرے پاس بیٹھے رہیں اور سنتے رہیں۔ ہمارا ہوائی اڈہ صرف ایک تھا جسے ہندوستانی تباہ کرنا چاہتے تھے ہر وقت ہندوستان کے آٹھ سے بارہ طیارے ڈھاکہ کی فضا میں رہتے تھے۔ فضا راکٹوں اور مشین گنوں کے دھماکوں سے کانپتی رہتی تھی۔ ہر وقت ہمارے دو تین ہوا باز فضا میں اتنے زیادہ ہندوستانی طیاروں سے لڑتے نظر آتے تھے۔ ہندوستانی طیارے جل جل کر گرتے تھے۔ ہماری طیارہ شکن مشین گنوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بمباری کا یہ عالم تھا کہ ڈھاکہ ہلتا رہتا تھا۔ ہمارے مٹھی بھر ہوا بازوں نے جس جانبازی سے مقابلہ کیا وہ مغربی پاکستان والوں نے نہیں دیکھا۔ وہ میں نے دیکھا ہے، وہ ہندوستانی ہوا بازوں نے دیکھا ہے اور وہ شیخ مجیب کے بنگالیوں نے دیکھا ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ ہمارا دشمن اگر ذرا سا بھی دیانتدار ہوا تو وہ ہمارے ان ہوا بازوں کی شجاعت کا ذکر اپنی تاریخ میں ضرور کرے گا.....

"اس حالت میں جب آسمان سے گولیاں، راکٹ اور بم برس رہے تھے، ہم لوگ فوج کی ضرورت پوری کر رہے تھے۔ اب یہ کام بے حد خطرناک اور دشوار ہو گیا تھا۔ میرا خاندان میرے بنگالی دوست کے گھر میں تھا۔ انہیں ہر طرح کا آرام میسّر تھا۔ میں اور میرے بیٹے کئی کئی روز گھر نہیں جاتے تھے۔ سپلائی کا یہ حال تھا کہ ہم آرڈر لیتے تھے، سامان جس قدر ملے پہنچا دیتے تھے، فوج نے بل کی ادائیگی کر دی تو ہم لے لیتے تھے ورنہ کبھی خیال دل میں بھی نہیں آیا تھا کہ پیسے بھی وصول کرنے ہیں.....

۱۲ دسمبر یا شاید ۱۳ دسمبر کا واقعہ ہے کہ میری ایک پنجابی دوست سے ڈھاکہ میں ملاقات ہو گئی۔ وہ بوگرا کی طرف سپلائی کا کام کرتا تھا۔ بہت پریشان تھا۔ اُس نے بتایا کہ بوگرا کی طرف فوج کو گھی چینی کی ضرورت ہے مگر اس طرف دونوں چیزیں نہیں مل رہیں۔ وہ انہی چیزوں کی تلاش میں آیا تھا۔ اسے اور بھی بہت سے کام تھے۔ اُس نے گھی اور چینی کی سپلائی میرے ذمے کر دی اور خود چلا گیا۔ بوگرا بہت دور جگہ تھی

راستے میں خطرہ بہت تھا۔ بہرحال میں نے بنگالیوں کی مدد سے بناسپتی گھی اور چینی کا خاصا سٹاک حاصل کر لیا۔ میرا پنجابی دوست خلافِ توقع کام سے فارغ ہو کر آ گیا۔ میں نے سوچا کہ وہ سامان لے جائے گا مگر اُس نے ایسے جذباتی طریقے سے ضد کی کہ میں اس کے ساتھ چلوں کہ میں اسے ٹال نہ سکا۔ میں نے گھر والوں سے کہا کہ میں دو تین دنوں تک واپس آ جاؤں گا۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ میں دو تین دنوں تک نہیں بلکہ دو تین برسوں کے لئے اپنے کنُبے سے جدا ہو رہا ہوں.....

"بوگرا تک ہم بڑی دشواریوں میں سے گزر کر پہنچے۔ ندی نالوں کے پُل ٹوٹے ہوئے تھے۔ راستہ ملنا محال تھا۔ آگے دریائے جمنا تھا۔ یہ چوڑا دریا فوج کی موٹر بوٹ میں پار کیا اور بوگرا کے قریب ایک ویران جگہ پہنچے۔ یہ جنگل میں چھپی ہوئی جگہ تھی اور یہاں سپلائی رکھی ہوئی تھی۔ اگلے روز میں اپنے دوست کے ساتھ بوگرا شہر میں چلا گیا۔ جنگ بوگرا سے آگے ہلّی کے مقام پر ہو رہی تھی اور یہ بڑی خونریز جنگ تھی بوگرا میں ہماری جو فوج تھی وہ اچھی حالت میں نہیں تھی۔ مجھے شک ہونے لگا کہ دشمن سر پر آ گیا ہے.....

دشمن اسی رات آ گیا اور طوفان کی طرح آیا۔ ہماری فوج جو ہلّی کے ارد گرد ۲۰ نومبر سے لڑ رہی تھی، ہندوستان کے اتنے بڑے لشکر کے آگے ٹھہر نہ سکی۔ اسے طیاروں کی کوئی مدد حاصل نہیں تھی اور تعداد بہت ہی تھوڑی تھی۔ ہندوستان کے کئی ڈویژن حملہ آور ہوئے تھے۔ ساری رات ہندوستانی توپخانے نے بوگرا پر گولوں کی بارش برسائے رکھی۔ میں پہلی بار جنگ میں آیا تھا۔ میرے پاس ریوالور تھا اور چوبیس گولیاں۔ ان سے میں ہندوستانی توپ خانے کو خاموش نہیں کر سکتا تھا.....

"رات کونوں کھدروں میں چھپتے گزر گئی۔ گولے دیواریں پھاڑ کر اندر پھٹتے تھے۔ تباہی سی تباہی تھی۔ میں کیڑوں مکوڑوں کی طرح چھُپتا، جگہیں بدلتا اپنے دوست سے جُدا ہو گیا۔ صبح ہوئی تو بوگرا کی تباہی نظر آئی۔ گولا باری جاری تھی۔ دن کے پچھلے پہر گولا باری بند ہو گئی اور یہ خبر پھیل گئی کہ ہندوستانی فوج ڈھاکہ میں داخل ہو گئی ہے اور ہماری فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ میں دوڑا دوڑا اپنے فوجیوں کے پاس پہنچا۔ میں نے دو افسردل

کو زار و قطار روتے دیکھا۔ ایک جگہ پانچ چھ سپاہی گالیاں دے رہے تھے۔ ان سے تصدیق ہو گئی کہ یہ خبر بالکل صحیح ہے۔ میں نے ایک کرنل سے بات کی۔ وہ زخمی تھا۔ اُسے بتایا کہ میرا خاندان ڈھاکہ میں ہے۔ اس نے کہا کہ مکتی باہنی کے ہاتھوں مرنا چاہتے ہو تو ڈھاکہ کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ قید ہونا چاہتے ہو تو یہیں ٹھہرو۔ ہندوستانی فوج آ رہی ہے۔ وہ ہم سب کو قیدی بنا لے گی ..... بہرحال اُس کے ساتھ باتیں کرتے مجھ پر واضح ہو گیا کہ میں اپنے خاندان تک زندہ نہیں پہنچ سکوں گا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ میرا خاندان زندہ رہے۔ اب تو پورے خاندان کو ہندوستان کی قید میں جانا تھا۔ مجھے اپنے بنگالی دوست پر بھی بھروسہ تھا۔ اچانک میرے اندر یہ جذبہ جاگ اٹھا کہ میں ہندو کا قیدی نہیں بنوں گا۔ میں نے وہاں سے بھاگ نکلنے کا ارادہ کر لیا.....

"میرے اندر صرف جذبہ تھا اور دل میں ہندو کے خلاف نفرت۔ اس کے علاوہ پاک فوج کی شکست اور مشرقی پاکستان پر ہندو کے قبضے نے میرا دماغ میرے قابو سے باہر کر دیا۔ میں نے اور کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ سوائے اس کے کہ ہندو کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ میں وہاں سے چل پڑا۔ ہندوستانی فوج شہر کو گھیرے میں لئے ہوئے تھی۔ ہتھیار ڈالے جا چکے تھے۔ میں شہر سے ذرا باہر ایک جگہ چھپ گیا۔ مجھے مکتی باہنی کے بنگالیوں کے نعرے اور فتح کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں اور ہندوستانی فوج شہر میں آ رہی تھی۔ مجھے وہاں سے نکل بھاگنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے یہ ارادہ بھی کر لیا کہ میرے پاس ریوالور ہے۔ اگر میں ہندوؤں کے گھیرے میں آ گیا تو اپنے آپ کو گولی مار لوں گا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ہندوستانی فوجی میرے قریب سے گزر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ یہاں سے نکل سکوں گا یا نہیں۔"

"میں لوگرا شہر سے تقریباً ایک میل دُور ایک پگڈنڈی کے قریب ایسے کھڈ میں چھپا ہُوا تھا جسے مشرقی پاکستان کے مخصوص جھاڑی نما درختوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ رات بھر میرے قریب سے گاڑیاں گزرتی رہیں۔ ٹینک بھی گزرے اور پیدل فوجی بھی گزرے۔ گولا باری بند ہو چکی تھی۔ دُور سے اِکّی دُکّی گولی چلنے کا دھماکہ سنائی دیتا تھا۔ مجھے یہ اطمینان ہو گیا کہ میں جہاں چھپا ہُوا ہوں وہاں مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ کسی کو اِدھر اُدھر دیکھنے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ رات کا اندھیرا ابھی تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ دن کی روشنی میں کیا کروں گا اور کہاں جاؤں گا ——— رات گزرتی جا رہی تھی اور انڈیا کی فوج بھی گزرتی جا رہی تھی۔ ایک گاڑی جو غالباً جیپ تھی میرے قریب آ کر رُک گئی۔ باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگ کسی کے انتظار میں رُک گئے ہیں اور یہ بھی معلوم ہُوا کہ وہ ڈرے ہوئے بھی ہیں۔ ایک نے کہا ——— "یہ افواہ ہے"۔ دوسرے نے کہا ——— "آرڈر ملا ہے۔ آرڈر تو جھوٹ نہیں ہو سکتا"!.....

"یہ دشمن کا فراڈ ہے"۔ پہلے نے کہا ——— "پاکستانی بڑی حرامی نسل ہے۔ مر جاتے ہیں قید نہیں ہوتے۔ یہ ان کی چال ہے۔ تم دیکھ لینا صبح ہمارا سارا ڈویژن پاکستانیوں کے گھیرے میں ہو گا"!

"ہم بھاگ تو نہیں سکتے" ——— دوسرے نے کہا ——— "آرڈر ملا ہے کہ دشمن نے ہتھیار رکھ دیئے ہیں۔ سارے ڈویژن کے افسر پاگل تو نہیں ہو گئے"۔

"دونوں میں تھوڑی دیر بحث چلتی رہی۔ جس نے کہا تھا کہ پاکستانی مر جاتے ہیں قید نہیں ہوتے، اپنے ساتھی کو بتانے لگا۔ وہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں کسی محاذ پر لڑا تھا۔ اس نے اپنا تجربہ سنا کر ثابت کرنے کی کوشش کی کہ پاکستانی سپاہی قید نہیں ہوتے۔ دوسرے نے

بھاگ جانے کی ترکیبیں بھی ایک دوسرے کو بتاتے رہے مگر حکم کے پابند تھے۔ آخر ایک نے کہا — "اگر گھیرے میں آگئے تو فوراً ہتھیار رکھ دینا۔ ستمبر پینسٹھ میں ہمارے جو قیدی پاکستان سے واپس آئے تھے بتاتے تھے کہ پاکستانی ہمارے قیدیوں کی بہت عزت خاطر کرتے ہیں"۔۔۔۔

"تھوڑی دیر بعد وہ چلے گئے مگر مجھے بھی شک میں ڈال گئے۔ میں بھی ماننے کو تیار نہیں تھا کہ ہماری فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ میں نے یہ ارادہ بھی کیا کہ بوگرا واپس چلا جاؤں، لیکن عقل نے ساتھ دیا اور میں نے سوچا کہ میں نے اپنے ایک کرنل اور کئی جوانوں کو روتے دیکھا ہے۔ گولا باری اور ہر قسم کی فائرنگ بند ہو چکی ہے۔ ہندوستان کی اتنی زیادہ فوج بہت دیر سے آگے جا رہی ہے۔ بوگرا دور تو نہیں تھا۔ یہ فوج یقیناً بوگرا میں پہنچ کر ہماری فوج سے ہتھیار ڈلوا رہی ہے۔ مجھے بہت ہی زیادہ رنج ہوا۔ ہمارے دشمن کے فوجیوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ پاکستان کی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ ان پر پاکستانی فوج کی دہشت طاری تھی، مگر یہ حقیقت کس قدر دردناک ہے کہ ہمارے لیڈروں نے اپنی فوج کو اس دشمن کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا جس کے دل سے ستمبر پینسٹھ کا خوف ابھی تک نکلا نہیں تھا۔ ہندوستان کا یہ فوجی جس نے میرے قریب کھڑے ہو کر کہا تھا کہ پاکستانی مر جاتے ہیں قید نہیں ہوتے، بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں فوجی نہیں تھا پھر بھی میرا عزم یہ تھا کہ مر جاؤں گا ہندو کی قید میں نہیں جاؤں گا۔ میں قید ہو جاتا تو کوئی قیامت نہ آ جاتی۔ میں سیاسی لیڈر یا فوجی کمانڈر نہیں تھا۔ میں ایک غیر اہم شہری تھا۔ مجھ پر ہندوستان والے کوئی الزام عائد نہیں کر سکتے تھے۔ پکڑا جاتا اور قیدی کیمپ میں بند کر دیا جاتا اور سب کے ساتھ رہا ہو جاتا مگر میرا دل ہندو کے آگے جھکنے کو قبول نہیں کر رہا تھا۔ یہی میری مشکل تھی۔۔۔۔

"مجھے بیوی بچے بہت یاد آئے۔ ان کے لئے میں صرف دعا کر سکتا تھا۔ ڈر یہ تھا کہ بنگالی انہیں قتل کر دیں گے لیکن مجھے اپنے اس بنگالی دوست پر بھروسہ تھا جس نے انہیں اپنے گھر میں پناہ دے رکھی تھی۔ میرے بیٹے بھی جوان تھے۔ میں نے

ان سب کو خدا کے سپرد کیا اور ان کے لئے دعا کی۔ میں ان تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت ہی دور تھے۔ اب تو بوگرا بھی جو بمشکل ایک میل دور تھا اور جس کے جلتے ہوئے مکانوں کی روشنی کو بھی میں دیکھ سکتا تھا مجھ سے افق جتنا دور ہو گیا تھا۔۔۔۔

"میں نے اس کھڈ میں سے نکل کر اس طریقے سے آگے بڑھنا شروع کر دیا کہ اٹھتا، جھک کر کچھ دور تک جاتا اور چھپ جاتا۔ ہر طرف سے فوجی بوگرا کی طرف جا رہے تھے۔ اب یہ ریلا کم ہو گیا تھا۔ پگڈنڈی پر گاڑیوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ میں آوازوں اور آہٹوں پر کان لگائے کیڑوں کی طرح سرک رہا تھا، رینگ رہا تھا، اٹھتا تھا، جھک کر چلتا تھا اور چھپ جاتا تھا۔ ایک جگہ مجھے کسی چیز سے ایسی ٹھوکر لگی کہ میں سنبھلتے سنبھلتے گر پڑا۔ ہاتھ کسی سوئے ہوئے انسان کو لگا اور مجھے خون کی بو آئی۔ میں گھبرا کر اٹھا اور پرے ہٹ کر دیکھنے لگا۔ اندھیرے میں اتنا ہی پتہ چلتا تھا کہ مجھے مشین گن کی ٹھوکر لگی تھی۔ اس کے قریب چند ایک بکس تھے اور چار لاشیں پڑی تھیں۔ یہ نہیں دیکھا جا سکتا تھا کہ وردیاں ہری ہیں یا خاکی۔ میں وہاں سے بہت تیز چل پڑا۔ مجھے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ میں اس تک گیا۔ وہاں بھی لاشیں تھیں اور ایک فوجی کراہتا ہوا رینگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اس دلچسپی سے اس کے قریب جا بیٹھا کہ وہ پاکستانی ہوگا لیکن وہ ہندو نکلا۔ یہ ساری لاشیں ہندوستانی فوجیوں کی تھیں۔ میں نے جب اس کراہنے والے سے پوچھا کہ پاکستانی ہو؟ تو اس نے پاکستان کو، پاکستان کی فوج کو اور اپنے افسروں کو اور اندرا گاندھی اور شیخ مجیب الرحمٰن کو کراہتے ہوئے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ اس کی دونوں ٹانگیں بے کار ہو گئی تھیں۔۔۔۔

"یہ ہندوستانی فوج کی کسی کمپنی کی پوزیشن تھی۔ ہمارے جانبازوں نے ان کافروں کا برا حشر کیا تھا۔ لاشیں ہی لاشیں تھیں اور یہ بدبخت لاشوں میں زندہ تھا۔ میں نے اس ہندوستانی کے ساتھ جو سلوک کیا وہ آپ کو پسند نہیں آئے گا کیونکہ یہ مسلمان کا شیوہ نہیں لیکن میرے اس وقت کے احساسات کو آپ نہیں سمجھ سکتے۔

اُس نے جب مجھے بتایا کہ میرا نام پیارے لال ہے اور مَیں ضلع رہتک کا رہنے والا ہوں تو مَیں نے ریوالور نکال لیا لیکن مجھے خیال آ گیا کہ گولی کے دھماکے سے کوئی اِدھر دوڑا نہ آئے۔ مَیں نے اِدھر اُدھر ٹٹولا۔ مجھے ایک رائفل مل گئی۔ رہتک کے پیارے لال کے سر پر فولادی خود نہیں تھا۔ کم بخت نے اُتار پھینکا ہو گا۔ مَیں نے پوری طاقت سے اُسکے سر پر بٹ مارا۔ مَیں نے دیکھا کہ رائفل کے ساتھ سنگین بھی لگی ہوئی تھی۔ مَیں نے سنگین کئی بار اس کے پہلوؤں میں اور سینے میں ماری۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا جیسے میں بڑے ہی زہریلے ناگ کو مار رہا ہوں اور کبھی ایسے محسوس ہوتا جیسے مَیں سارے ہندوستان کو سنگین سے چھلنی کر رہا ہوں۔ میں جب تھک گیا تو سنگین اُس کے جسم میں داخل کر کے رائفل چھوڑ دی۔ رائفل اس کے جسم پر جھولتی رہی اور پھر معلوم نہیں کیا ہُوا کہ میں بچّوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہو گیا.....

"جب آنسو تھمے تو کچھ سکون سا محسوس ہونے لگا اور میں آگے کو چل پڑا۔ میں ہندوستان کی طرف جا رہا تھا۔ اُدھر ہی جانا تھا اور کوئی راستہ ہی نہ تھا۔ اُس رات اور اس سے چند دن بعد تک مشرقی پاکستان سے نکلنا کسی حد تک آسان تھا کیونکہ ہندوستانی فوج ہماری فوج سے جگہ جگہ ہتھیار ڈلواتے اور سب کو اکٹھا کرنے میں مصروف تھی اور مکتی باہنی جو جنگلوں اور ویرانوں میں گوریلا جنگ لڑتی رہی تھی، شہروں پر ٹوٹ پڑی تھی۔ مکتی باہنی کے لوگ وہاں لوٹ کھسوٹ اور بچے کھچے غیر بنگالیوں کے قتلِ عام میں مصروف ہو گئے تھے۔ لہٰذا جنگلوں کے رستے سرحد پار کرنا اتنا خطرناک نہیں تھا جتنا بعد میں ہُوا۔ بعد میں غیر بنگالی وہاں سے نکلتے رہے لیکن بڑی ہی مصیبت اور خطروں میں سے گزر کر نکلے، اور اُن میں سے بہت سے مارے بھی گئے تھے۔ یہ سب نیپال چلے گئے تھے۔ تاہم جب میں وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا، مَیں یہی سمجھ رہا تھا کہ کسی بھی وقت مجھے ہندوستانی فوج پکڑ لے گی یا گولی مار دیں گے.....

"میں ساری رات چھپ چھپ کر اور کان کھڑے کر کے آگے ہی آگے بڑھتا رہا اور صبح ہو گئی۔ ایک جوہڑ کے کنارے مجھے تین جھونپڑے نظر آئے۔ یہ مسلمانوں کے ہی ہو سکتے تھے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ بنگالی مسلمان ہمارے دشمن ہیں میں وہاں چلا گیا۔ مَیں زبان کے لحاظ سے اپنے آپ کو بنگالی ثابت کر سکتا تھا مگر دو چیزیں میرے لئے خطرہ پیدا کر رہی تھیں۔ ایک تو میرا قد بُت تھا۔ ایسا قد شاید ہی کسی بنگالی کا ہو گا۔ رنگ تو میرا اُن کے ساتھ ملتا تھا۔ دوسری خطرناک چیز میرا لباس تھا۔ پتلون، قمیص اور اوپر جیکٹ تھی۔ پاؤں میں اچھی قسم کے شوز تھے۔ جیب میں دو تین سَو روپیہ نقد تھا۔ ریوالور پتلون کی جیب میں تھا۔ ان خطروں کے باوجود مَیں ان جھگیوں کی طرف چلا گیا۔ مجھے راہنمائی کی ضرورت تھی۔ اسے میری دلیری سمجھئے یا حماقت کہ میں نتائج سے بے خبر چلا جا رہا تھا۔ مَیں جس علاقے میں سے گزر کر گیا وہاں گولوں کے گہرے گڑھے تھے کہیں کہیں خون بھی تھا۔ لاشیں بھی تھیں۔ کوئی اپنے جوان کی اور کوئی ہندوستانی فوجی کی۔ ہندوستانیوں کی لاشیں دیکھ کر تو ایمان تازہ ہو جاتا لیکن اپنے جوان کی کوئی لاش نظر آتی تھی تو اتنی سوچیں ذہن میں آ جاتی تھیں کہ دل بیٹھ جاتا تھا۔ زیادہ تر خیال یہی آتا تھا کہ یہ سب ایک ہزار میل دور سے یہاں اس سرزمین کے دفاع کے لئے آئے تھے۔ اب ان کے ماں باپ، بہن بھائی اور بچے ساری عُمر اِن کی راہ دیکھتے رہیں گے اور ان کی ہڈیاں اس بے وفا مٹی میں مل جائیں گی.....

"ایسی ہی سوچوں میں اُلجھا ہُوا میں جھگیوں تک پہنچ گیا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ ایک اس سے بوڑھا، تین چار عورتیں اور بہت سے بچّے۔ مَیں نے بنگالی میں باتیں کیں اور انہیں بتایا کہ میں کلکتے کا رہنے والا ہوں، مسلمان ہوں، یہاں کسی کام سے آیا تھا اور جنگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ اب پیدل کلکتے جا رہا ہوں۔ وہ میری بات مان گئے۔ ان غریبوں کے پاس جو کچھ تھا مجھے کھلایا۔ مَیں نے ان سے افسوس کا اظہار کیا کہ مشرقی پاکستان پر ہندوستان کی فوج کا قبضہ ہو گیا ہے۔ وہاں

دو ہی مرد تھے۔ انہوں نے اکٹھے بولنا شروع کر دیا۔ عورتوں کو مَیں نے روتے دیکھا۔
ان کی باتوں کا لبِ لباب یہ تھا کہ انہیں ایسے پاکستان کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں
تھی جس نے انہیں بھوکا رکھا تھا۔ پاکستان نہیں بنا تھا تو بھی اُن کی یہی حالت تھی
پاکستان بن گیا تو بھی یہی حالت رہی۔ البتہ ہندوستان یعنی ہندو کے خلاف ان کے
دلوں میں بہت نفرت تھی۔ وہ اس ملک کو بہر حال اپنا ملک سمجھتے تھے۔ ہندو کا غلبہ
برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اُن کے تین جوان لڑکے مکتی
باہنی میں ہیں۔ چند مہینے پہلے وہ کہیں سے غیر بنگالی چار عورتوں کو پکڑ لائے تھے۔
انہیں رات یہاں رکھا اور اگلے دن کہیں لے گئے تھے.....

"گزشتہ رات اُن پر ایک قیامت ٹوٹی تھی۔ ان تین جھونپڑوں میں اُن کی
دو جوان لڑکیاں تھیں۔ رات ہندوستان کے فوجی آئے۔ انہوں نے جھونپڑوں
کی تلاشی لی اور ان کی لڑکیوں کو گھسیٹ کر لے گئے۔ ان لوگوں نے بہت شور کیا
مگر انہوں نے لڑکیوں کو نہیں چھوڑا۔ گولی مارنے کی دھمکی دی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے
بعد لڑکیاں واپس آگئیں۔ اُس وقت سے وہ بے ہوش پڑی تھیں..... مَیں نے اس
جھونپڑے میں جانے کی جرأت نہیں کی جس میں وہ لڑکیاں بے ہوش پڑی تھیں۔
وہ کہتے تھے کہ ان کے لڑکے ہندوستانی فوج کی مدد کرتے رہے ہیں اور ہندوستانی
ہماری عزت خراب کر گئے ہیں۔ مَیں نے ان سے پوچھا کہ پاکستانی فوج کا اُن کے ساتھ
سلوک کیسا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ چھ سات مہینے گزرے پاکستان کے فوجی آئے تھے۔
انہوں نے مکتی باہنی کے کسی آدمی کے متعلق پوچھا اور ڈرایا تھا کہ وہ مکتی باہنی کے
کسی کے کسی آدمی کو پناہ نہ دیں۔ اس وقت بھی یہ لڑکیاں یہیں تھیں مگر پاکستان کے
فوجیوں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی تھی.....

"اُن کے ساتھ بہت سی باتیں ہوئیں۔ اسلام کے رشتے نے بہت مدد کی
مَیں نے سرحد تک راستہ معلوم کیا جو انہوں نے بتا دیا۔ مَیں نے انہیں پیسے
پیش کئے کہ ایک آدمی سرحد تک میرے ساتھ چلے۔ وہاں کی زمین ایسی ہے کہ

راستہ ذرا مشکل سے ملتا ہے۔ بھٹک جانے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں میں
کسی عام استعمال والے راستے پر نہیں جانا چاہتا تھا۔ مَیں ایک بنگالی کے ساتھ اُسی
وقت چل پڑا۔ وہ اُجرت پر راضی ہو گیا تھا۔ میں نے اس بنگالی سے کہہ دیا تھا کہ مجھے
کسی ویران راستے سے لے جائے۔ ہم جنگل، دلدل، میدان اور ٹیکریاں پھلانگتے گئے۔
شاید ہم تین میل گئے ہوں گے کہ ایسی جگہ آگئی جس کے دو طرف ٹیکریاں تھیں درخت
وغیرہ بھی تھے اور یہ جگہ ذرا نشیبی تھی۔ ہم ایک ٹیکری کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔
آگے جا کر ٹیکری ختم ہو جاتی تھی۔ اس مقام سے ہم دس بارہ گز دُور تھے کہ اچانک تین
بنگالی ٹیکری سے گھوم کر سامنے آگئے۔ ایک نے کہا ۔۔۔ "وہ آرہے ہیں"۔۔۔
میرے گائیڈ نے مجھے بتایا کہ یہ اُن کے لڑکے ہیں۔ وہ حیران تھا کہ وہ یہاں
کیوں آگئے۔ اُن میں سے ایک کے پاس سٹین گن تھی، ایک کے پاس تلوار نما چھرا
اور تیسرے کے پاس لمبی تلوار تھی.....

"میں نے پتلون کی اُس جیب میں ہاتھ ڈال لیا جس میں ریوالور تھا۔ ریوالور
مٹھی میں لے کر انگلی ٹریگر میں ڈال لی۔ اُن تینوں میں سے ایک نے مجھے بنگالی
زبان میں کہا ۔۔۔ "تم پنجابی ہو اور اُدھر یہ کہہ کر آئے ہو کہ کلکتے کے رہنے والے
ہو"۔۔۔ مَیں ان سے ابھی پانچ چھ قدم دور تھا۔ اُسی آدمی نے کہا ۔۔۔ "سارے
پیسے ادھر رکھ دو اور کپڑے بھی اتار دو"۔۔۔ سٹین گن والے نے گن سیدھی کی۔ وہ
جاہل تھے۔ مجھے قریب آنے دیتے۔ میرے ہاتھ اوپر اٹھاتے اور تلاشی لے کر
میرے پیسے بھی نکال لیتے اور ریوالور بھی۔ لیکن مشرقی پاکستان کی فتح نے اُن کی عقل
پر پردہ ڈال دیا تھا۔ میں نے نہایت اطمینان سے ریوالور نکالا اور پلک جھپکنے بغیر
سٹین گن والے کی طرف سیدھا کر کے یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلا دیں۔ اس کی
پہلے تو گن گری، پھر وہ گرا۔ دوسرا سٹین گن اٹھانے لگا تو میں نے اُس پر بھی گولی
چلائی۔ وہ گرا اور تیسرا بھاگا مگر میرے ریوالور نے اسے بھاگنے نہیں دیا۔ فاصلہ

بہت تھوڑا تھا۔ گولی خطا ہو ہی نہیں سکتی تھی......

"میرا گائیڈ چیخ اُٹھا۔ اُس نے مجھے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ ان میں ایک اس کا بیٹا تھا۔ اس آدمی نے میرا گریبان پکڑ لیا اور جھنجھوڑ کر گالیاں دیتا رہا۔ وُہ بالکل نہیں ڈرا کہ میں اُسے بھی گولی مار دوں گا لیکن میں اسے گولی نہیں مارنا چاہتا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ ان تینوں نے معلوم نہیں کتنے غیر بنگالیوں کو قتل کیا ہوگا۔ انہوں نے عورتیں اغوا کر کے ہندوستان میں بیچی ہیں۔ انہوں نے پنجابیوں اور بہاریوں کے گھر لُوٹے اور جلائے ہیں۔ انہوں نے معصوم بچّوں کو بھی قتل کیا ہے۔ میں اسے بتاتا رہا مگر اُس کا بیٹا مارا گیا تھا۔ اس نے مجھے چھوڑ دیا اور اپنے بیٹے کی لاش پر جا گرا۔ وُہ بُری طرح رو رہا تھا۔ مَیں وہاں سے چل پڑا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اُس نے مجھے جاتے دیکھا تھا یا نہیں۔ مَیں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ تین مسلمانوں کو قتل کر کے میرے جذبات میں جو زلزلے آئے وہ میں بیان نہیں کر سکتا میں نے ایسا بالکل نہیں سوچا کہ وہ میرے دشمن تھے اور مَیں نے انہیں مار ڈالا ہے۔ میں جانتا تھا کہ ان تینوں نے غیر بنگالیوں پر کیسے کیسے ظلم کئے ہوں گے، مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ انہیں مغربی پاکستان کے سیاسی لیڈروں اور فوجی حکمرانوں نے بھوکا رکھ کر درندہ بنایا تھا۔ انہوں نے مغربی پاکستانیوں سے نگاہیں پھیریں تو وہ ہندوستان کے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر دریاؤں کی اس سرزمین نے غدار پیدا کئے...... مَیں یہ سب کچھ جانتا تھا اس لئے ان تین بنگالی مسلمانوں کو جان سے مار کر دل میں ایسی خلش پیدا ہو گئی جو ساری عمر مجھے چین نہیں لینے دے گی۔ میں نے اپنی جان بچانے کے لئے انہیں مارا تھا۔ انہیں دشمن نہیں سمجھا تھا......

"میرا گائیڈ مجھ سے الگ ہو گیا تھا لیکن اُس سے میں نے راستہ معلوم کیا تھا۔ اب یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ یہ بنگالی دوسروں کو جا کر بتائے گا کہ میں نے مکتی باہنی کے تین آدمیوں کو قتل کر دیا ہے پھر نہ جانے مکتی باہنی کے کتنے ہی آدمی میرے تعاقب میں آ جائیں۔ اُن تینوں کو قتل کرنا میرے لئے ضروری تھا، ورنہ وہ مجھے قتل کر دیتے۔

میرے لئے اب خطرہ ہی خطرہ تھا۔ بنگالی بھی دشمن ہندوستانی بھی دشمن۔ میں عام راستوں سے ہٹ کر جنگلوں جھاڑیوں ٹیکریوں اور کھڈوں میں چُھپ چُھپ کر بہت تیز چلا جا رہا تھا۔ دھیان ہر طرف لگا ہُوا تھا۔ ایک مشکل یہ بھی پیدا ہو گئی کہ اوپر سے ہیلی کاپٹر گزرنے لگے۔ یہ بوگرا کی طرف جا رہے تھے۔ مَیں جب ہیلی کاپٹر کو دیکھتا تو کسی درخت کے نیچے ہو جاتا تھا۔ ایک ہیلی کاپٹر نے تو شاید مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس کی بلندی چند سو فٹ تھی۔ میرے اُوپر سے گزر گیا اور واپس آ گیا۔ پھر میرے اوپر چکر لگانے لگا اور اس کی بلندی کم ہوتی گئی۔ میں درخت کے نیچے کھڑا دیکھتا رہا اور میرا خون خشک ہوتا رہا۔ میں نے ریوالور نکال کر اس میں گولیاں بھر لیں۔ مجھے یہی توقع تھی کہ یہ ہیلی کاپٹر اترے گا اور مجھے پکڑ لیا جائیگا۔ آخر وہ چلا گیا......

"میں ایک ٹیکری پہ چڑھ گیا۔ اوپر جھاڑیاں وغیرہ تھیں۔ ان میں چھپ کر ہر طرف دیکھا۔ وہ ہندوستانی فوجی نظر آئے۔ تین چار فوجی گاڑیاں بھی جاتی دیکھیں۔ سارا علاقہ بتا رہا تھا کہ یہاں توپوں کے ہزاروں گولے پھٹے ہیں...... میں ٹیکری پہ تھوڑی دیر لیٹا رہا۔ مَیں رات کو سویا نہیں تھا۔ مجھ پہ غنودگی طاری ہونے لگی اور اس کے ساتھ ہی ذہن گزرے ہوئے وقت میں جا پہنچا۔ مجھے پہلی بیوی یاد آئی جسے میں نے قتل کیا تھا۔ اُس وقت میں بزدل ہُوا کرتا تھا۔ بیوی کو قتل کر کے دل میں جو ذرّہ بھر طاقت تھی وہ بھی ختم ہو گئی تھی اور مَیں بھاگ اُٹھا تھا۔ اس بیوی نے مجھے بُزدل کہا تھا اور دوسری بیوی نے بھی مجھے ڈرپوک کہہ کر مجھ سے نظریں پھیر لی تھیں۔ مجھے یہ بیوی (عائشہ) ایسی یاد آئی کہ میں تڑپ اُٹھا۔ میں اُسے ڈھاکہ میں تنہا نہیں چھوڑ آیا تھا۔ پھر بھی یوں محسوس ہوتے لگا جیسے مَیں اُسے درندوں کے آگے پھینک کر بھاگ آیا ہوں اور وہ مجھے بے وفا اور بزدل کہے گی۔ اس قسم کے الٹے سیدھے خیال ذہن میں آ کر مجھے پریشان کرنے لگے۔ کبھی تو میرا عزم متزلزل ہو جاتا اور میں یہ ارادہ کر لیتا کہ اپنے آپ کو ہندوستانی فوج کے حوالے کر دوں اور کہوں کہ مجھے بیوی

بچوں کے پاس پہنچا دو اور مجھے ان سب کے ساتھ گولی مار دو۔ اور یہ خیال بھی آیا کہ میری قسمت میں خدا نے صرف فرار ہی لکھ ڈالا ہے۔ یہ میری زندگی کا تیسرا فرار تھا......

"اس کے ساتھ ہی ایک اور خطرہ ذہن میں آگیا اور یہ خیال آیا کہ اگر میں ہندوستان میں سے گزر کر پاکستان میں چلا گیا تو یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے پہلی بیوی کے رشتے دار مل جائیں۔ وہ مجھے گرفتار کرا دیں گے۔ میں غور کرنے لگا کہ یہ ممکن ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس پہلو نے میری ڈھارس بندھائی کہ میں نے قتل کی واردات ہندوستان میں کی تھی، پاکستان بننے سے چار سال پہلے۔ اگر میں گرفتار ہو بھی گیا تو قتل ثابت نہیں ہو سکے گا۔ تاہم پکڑے جانے کا خطرہ میرے دل سے نہ نکلا اور مجھے یوں نظر آنے لگا جیسے میری قسمت میں چوتھا فرار بھی لکھا ہوا ہے..... میں ایسے ہی خیالوں اور سوچوں میں الجھا رہا۔ دور کہیں گولی فائر ہوئی جس کے دھماکے نے مجھے بیدار کر دیا اور میں حقیقی عالم میں آگیا۔ میں اُٹھا اور ٹیکری سے اُتر گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ہندوستانی فوجی مل گئے تو مجھے کیا کرنا ہے۔ یہ ایک خطرہ تھا جو مول لینے کو تیار ہو گیا۔ میں نے ریوالور پتلون کے اندر گھٹنے سے نیچے پنڈلی کے ساتھ باندھ لیا۔ پتلون کھلی تھی۔ ریوالور کا باہر سے پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں ریہرسل بھی کر لی۔ یہاں میں اپنے پڑھنے والے دوستوں کو یہ فلسفہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ خطروں میں جب کوئی گھر جاتا ہے تو اُس کی سوچنے کی صلاحیت ختم یا کمزور ہو جاتی ہے۔ اگر آپ زندگی میں کسی بھی خطرے میں آجائیں تو ذہن کو خوف اور بزدلی سے بچائیں۔ سوچنے کی صلاحیت کو کمزور نہ ہونے دیں۔ میں نے اسی فلسفے کے تحت سوچا تھا کہ چھُپ چھپ کر چلنے سے میں کسی کو نظر آگیا تو دیکھنے والے فوراً پکڑ لیں گے۔ چنانچہ میں سینہ تان کر اور خود اعتمادی سے چلنے لگا.....

"چلتے چلتے میں میدانی علاقے میں پہنچ گیا۔ کہیں کوئی جیپ جلی پڑی تھی اور کہیں دوسری گاڑی۔ ایک توپ بھی نظر آئی۔ کہیں کہیں کوئی لاش بھی ...

جاتی تھی۔ مورچے بھی کھدے ہوئے تھے۔ ایک مورچے میں پاک فوج کے دو جوانوں کی لاشیں دیکھیں۔ ایک ٹرک کا جلا ہوا ڈھانچہ دیکھا جس سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا جا رہا تھا، جنگ کے آثار زیادہ ہوتے جا رہے تھے اور زیادہ خوفناک بھی ہو گئے تھے۔ پاک فوج کی لاشیں زیادہ تھیں۔ تھوڑی ہی دور ہندوستانی فوجی نظر پڑے اور میں نے امید افزا چیز یہ دیکھی کہ وہاں سویلین لوگ بھی گھوم پھر رہے تھے۔ ان سے تھوڑی ہی دور مجھے ریلوے سٹیشن نظر آرہا تھا۔ میں فوجیوں کی طرف چل پڑا۔ اُن میں ایک میجر اور دو کیپٹن تھے اور کچھ جوان۔ میں نے دُور سے ہی بازو اوپر کر کے نعرہ لگایا۔ 'جے ہند۔ جے بھارت'۔ اور دوڑ کر میجر سے بغل گیر ہو گیا۔ پھر دونوں کپتانوں سے ہاتھ ملایا اور پھر قریب کھڑے ہندوستانی جوانوں کی پیٹھیں تھپکائیں۔ میں نے بنگالی زبان میں انہیں فتح کی مبارک دی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ بنگالی نہیں ہیں۔ اُن کے قد اور شکلیں بتا رہی تھیں کہ پنجابی ہیں.....

"آپ اُردو نہیں بول سکتے؟" میجر نے کہا۔ "ہم بنگالی نہیں سمجھتے"۔

"میں نے بنگالی لب و لہجے میں اُردو بولنی شروع کر دی۔ میں نے ایسی خوشی کا اظہار کیا اور اُن کی بہادری کی اتنی تعریف کی کہ وہ کم بخت میرے چکر میں آگئے۔ میں نے میجر کو کندھوں سے پکڑ کر کہا کہ بھارت ماتا کے سپوتو، مغربی پاکستان کو بھی بھارت ماتا کی جھولی میں ڈال دو، تم دلبر ہو، تم شیر ہو...... اور میں دیوانگی کی حالت میں جو بناوٹی تھی، بولتا ہی چلا گیا۔ آخر میجر نے پوچھا ـــــ "آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟"

"میرا نام سبھاش چندر ہے"۔ میں نے جواب دیا۔ "میں کلکتہ کا رہنے والا ہوں۔ چاکیو اڈہ میں میرا گودام ہے۔ اسی کے اوپر دفتر ہے۔ آپ کلکتے آئیں۔ میں امپورٹڈ وہسکی پیش کروں گا۔ ڈیڑھ مہینے سے بوگرا میں پھنسا ہوا ہوں۔ مکتی باہنی کے لئے سامان کا آرڈر تھا۔ یہاں آکر مسلمان بن جاتا ہوں۔ اپنی سرحد کے اندر جا کر سبھاش چندر ہو جاتا ہوں ...

”میں نے انہیں جھوٹی خبریں سنائیں کہ بوگرا میں پاکستانیوں نے کس طرح ہتھیار ڈالے ہیں اور بھارت ماتا کے بیٹوں نے کس بہادری سے ہتھیار ڈلواتے ہیں۔ مجھے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ میں اتنی اچھی ایکٹنگ کر سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میری کامیابی کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ ہندوستانی افسر فتح کے نشے میں بدمست تھے، احمق بھی تھے اور فتح کے متعلق انہیں کچھ شک بھی تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرا کام ختم ہو گیا ہے اور پیدل ہی چل پڑا ہوں۔ سرحد پار کر کے کوئی ٹرانسپورٹ مل جائے گی۔
میجر نے کہا ”آپ کو تکلیف تو ضرور ہو گی۔ فاصلہ بہت ہے۔ سرحد سے تھوڑی ہی دور بن گاؤں سے آپ کو ریل گاڑی مل جائے گی“ ۔ میں نے کہا ”ہاں ہاں وہ تو مجھے معلوم ہے“ ۔ حالانکہ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے بن گاؤں کا نام یاد کر لیا۔ ان سب سے ہاتھ ملایا اور ’جے بھارت‘ کا نعرہ لگا کر آگے چل پڑا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ یہ فتح کا پہلا دن تھا۔ ہندوستانیوں کو فتح ہو چکی تھی پھر بھی وہ تسلیم نہیں کرتے تھے کہ انہوں نے پاکستانی فوج سے ہتھیار ڈلوا لئے ہیں۔ لہٰذا ان کی ذہنی حالت نارمل نہیں تھی۔ اس کے علاوہ نئی صورتِ حال سے افراتفری مچی ہوتی تھی۔ اس سے میں فائدہ اٹھا رہا تھا، لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا جتنا آسانی سے میں لکھ رہا ہوں۔ میں سویلین تھا، مسلمان تھا، میرے پاس ریوالور تھا اور میں مشرقی پاکستان کا شہری تھا......

”میں تیز تیز قدم اٹھاتا گیا اور چھوٹے سے ریلوے سٹیشن تک چلا گیا۔ یہ ہلی کا سٹیشن تھا۔ کھنڈر بن چکا تھا۔ ارد گرد پاکستانی جوانوں کی کئی لاشیں دیکھیں۔ ریت کی بوریوں، لکڑیوں اور پتھروں کے بنکر نما مورچے بھی دیکھے۔ اِدھر اُدھر مارٹر گنیں اور مشین گنیں بھی پڑی دیکھیں۔ جہاں تک یہ علاقہ مجھے نظر آتا تھا بموں اور توپوں کے گولوں سے پھٹنے کے گڑھے، ٹرکوں کے ٹائروں کے اور ٹینکوں کے پٹوں کے نشان تھے۔ ایک جگہ میں نے کسی فوجی کی ایک ٹانگ پڑی ہوئی بھی دیکھی

اور سب سے زیادہ جو ہیبت ناک چیز دیکھی وہ گدھ تھے جو ہزاروں کی تعداد میں اُتر آئے تھے اور اُڑ بھی رہے تھے۔ جنگ کی ہیبت کا یہ آخری ہولناک منظر تھا۔ یہ گدھ انسانوں کو کھا رہے تھے۔ ہندوستانی اور پاکستانی فوجیوں کی لاشیں کھا رہے تھے۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں اس منظر کو بیان نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ پاکستان کے حکمرانوں سے اور اپنی قوم سے یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ وہ جوان جنہیں مشرقی پاکستان اور ہندوستان کے گدھ مل کر کھا گئے ہیں وہ ہمارے بیٹے تھے۔ وہ پاکستان کے بیٹے تھے۔ وہ اُن کے بیٹے تھے جنہوں نے پاکستان بنایا تھا۔ وہ پنجاب اور سرحد کی جنگجو سرزمین کے بیٹے تھے۔ انہیں بھول نہ جانا پاکستانیو! میں کربلا کے اس میدان سے گزر آیا ہوں جہاں وہ سبز پرچم کی ناموس پہ لڑے اور شہید ہو گئے تھے......

”یہ تو مجھے یہاں آ کر ’حکایت‘ کے ایک شمارے (مارچ ۱۹۷۴ء) سے پتہ چلا ہے کہ میں ہلی کے اُس میدان میں کھڑا تھا جہاں ایک خونریز معرکہ لڑا گیا تھا اور جہاں ہمارے ایک جانباز نے جان کا نذرانہ دے کر نشانِ حیدر کا اعزاز پایا ہے اور ’حکایت‘ کے صفحات پر میں نے پڑھا کہ ہندوستانی فوج کے بڑے افسروں نے بھی ہمارے ان جانبازوں کی بے ساختہ تعریف کی ہے جو ہلی کے میدان میں لڑے تھے۔ مشرقی پاکستان میں جنگ ۴ دسمبر ۱۹۷۱ء سے شروع ہوئی تھی لیکن ہلی کے مورچوں میں جنگ ۲۰ نومبر ۱۹۷۱ء سے شروع ہو گئی تھی اور ۱۶ دسمبر تک لڑی جاتی رہی۔ اگر مجھے وہاں پتہ چل جاتا کہ ہمارے افسروں اور جوانوں نے یہاں دشمن کا یہ حشر کیا تھا جو ’حکایت‘ میں شائع ہوا ہے تو میں ہلی کو چومتا۔ وہاں سجدے کرتا اور ہلی کی مٹھی بھر مٹی اٹھا کر یہاں لے آتا اور ہر صبح اس کے آگے سجدہ کر کے روزمرہ کا کام شروع کیا کرتا......

”میں وہاں سے بھی گزر آیا۔ ہندوستانی فوج کے افسر اور سپاہی بھی وہاں ملے۔ بجائے اس کے کہ کوئی مجھے بلا کر پوچھتا کہ تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے

ہو، میں نے وہی ایکٹنگ کی جو میں پہلے کر چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہندوستان کے جو فوجی مجھے سرحد کے قریب ملتے تھے وہ ابھی تک اپنی فتح کے متعلق شک شک میں تھے۔ آپ یقین کریں کہ ایک سکھ کرنل نے مجھ سے رازداری سے پوچھا — "مسٹر سبھاش! آپ نے کسی کو ہتھیار ڈالتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟" — میں نے اُسے ہوا دینے کے لئے ایسے جھوٹ بولے کہ سکھ کو غبارے کی طرح بھر دیا۔ میں اس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا تو میرے ارد گرد فوجی اکٹھے ہو گئے۔ میں نے اُن کی ذہنیت کے مطابق اور اُن کی اُس وقت کی ذہنی حالت کے مطابق انہیں پاک فوج کی شکست کے افسانے سنائے اور ہندوستانی فوج کے ایسے ایسے کارنامے سنائے کہ یہ سب ہندوستانی جو میرے گرد کھڑے تھے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے جیسے شک میں پڑ گئے ہوں۔ یہ لوگ مجھ سے اتنے متاثر ہوئے کہ میں وہاں سے چلنے لگا تو سکھ کرنل نے مجھے روک کر کہا — "اگر آپ آدھا گھنٹہ رک جائیں تو ہماری ایک گاڑی جا رہی ہے، اس پہ چلے جانا" — میں رُک گیا۔ انہوں نے مجھے چائے پلائی۔ پکوڑے کھلائے۔ مجھے سبھاش چندر سمجھ کر مجھ پر اعتماد کیا اور میری جان پہ بنی رہی۔ پکڑے جانے کے ڈر کے علاوہ میرے اندر غصے اور غم کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ میں اِن کافروں کو زندہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا مگر میں بے بس تھا۔ میں ذہنی اذیت میں [illegible]ا تھا.....

"اِس اذیت کا اور ایکٹنگ کا حاصل یہ تھا کہ ان کا جو ٹرک پیچھے جا رہا تھا مجھے اس پہ بٹھا دیا گیا۔ ٹرک میں چھ سپاہی تھے اور بہت سا سامان تھا۔ میں ہندوستان میں داخل ہو گیا۔ یہی وہ مقام تھا، یہی علاقہ تھا جہاں سے میں، ۴۷ء میں مشرقی پاکستان میں داخل ہوا تھا۔ اُس وقت میرے جذبات میں مسرت کی موجیں اُٹھ رہی تھیں جیسے میں ہندوستان کو فتح کر کے پاکستان میں داخل ہو رہا ہوں۔ میں جہنم سے نکل کر جنت میں داخل ہوا تھا۔ میں نے بزدل کو ہندوستان میں پھینک کر

ایک دلیر آدمی کے روپ میں پاکستان میں قدم رکھا تھا جیسے میں نے مرے ہوؤں میں سے اُٹھ کر نئی زندگی پائی تھی۔ مگر ۱۹۷۱ء میں میری جنت جل رہی تھی اور میں اس سے بھاگ رہا تھا۔ مشرقی پاکستان کا غم آپ سب کے دلوں میں ہو گا لیکن یہ غم میرے دل میں یا ہر اُس پاکستانی کے دل میں دیکھئے جو وہاں سے میری طرح بھاگنے پر مجبور ہوا تھا۔ ہمارے دلوں میں آپ کو بڑا ہی گہرا گھاؤ نظر آئے گا۔ میں نے بڑی ہی مشکل سے آنسو روکے۔ اگر میرے آنسو نکل آتے تو میں پکڑا جاتا۔ میں نے باہر دیکھنے کی بجائے سر جھکا لیا اور ٹرک چلتا رہا......

"ٹرک رُک گیا۔ یہ سپلائی سنٹر تھا۔ میں نے ڈرائیور سے بن گاؤں ریلوے سٹیشن کا راستہ پوچھا۔ یہ سٹیشن وہاں سے دو اڑھائی میل دور تھا۔ میں فوجیوں میں گھوم پھر رہا تھا۔ میری طرف کوئی دیکھتا تو میں اُسے فتح کی مبارک دے کر اس کے شکوک رفع کر دیتا۔ میری چال ڈھال میں جو خود اعتمادی تھی اس سے کسی کو شک نہیں ہوتا تھا کہ میں ان کا دشمن ہوں۔ میں فوجیوں میں سے گزرا، اور میں بنگالی شہریوں میں سے گزرا۔ ہر کوئی خوش تھا۔ ایک جگہ بنگالی ناچ رہے تھے۔ فتح کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ میں ایک ویرانے میں سے گزرا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے چڑیلیں اور بدروحیں میرے تعاقب میں آ رہی ہوں۔ ذہنی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ تھکان اور بھوک کا اثر الگ تھا۔ اپنے کنبے کا فکر بھی پریشان کر رہا تھا اور جب یہ خیال آتا تھا کہ مجھے سارے ہندوستان میں سے گزر کر پاکستان تک پہنچنا ہے تو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ اسی ذہنی حالت میں بن گاؤں میں داخل ہوا اور ریلوے سٹیشن پہنچا۔ آخری گاڑی کی روانگی میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ وہاں مجھے یاد آگیا کہ میرے پاس کرنسی مشرقی پاکستان کی ہے یعنی جیب میں دو ہزار تین سو روپیہ ہوتے کے باوجود میں کنگال تھا۔ وہاں سے نکلنے کا ذریعہ یہی تھا کہ بلا ٹکٹ گاڑی میں بیٹھ جاتا.....

"کاروباری لحاظ سے ہندو کا دماغ اس قدر تیز ہے کہ ہر صورتِ حال سے پیسہ کمانے کی ترکیب نکال لیتا ہے۔ میں نے ریلوے سٹیشن کے باہر تین چار ہندو

دیکھے جو ہاتھوں میں نوٹوں کے بنڈل لئے ٹہل رہے تھے۔ میں اُن کے پاس سے گزرا تو وہ سب میرے پیچھے پڑ گئے اور بنگالی زبان میں کہنے لگے ——
'بنگلہ دیش کی کرنسی انڈیا سے بدلی کرو گے؟'.....

"میں اُن کے قریب سے گزر گیا۔ میں اُن کے سامنے اتنی رقم جیب سے نہیں نکالنا چاہتا تھا اور مجھے یہ بھی سوچنا تھا کہ ساری رقم تبدیل کرالوں یا پاکستان کے لئے کچھ رہنے دوں۔ میں نے ڈیڑھ ہزار روپیہ تبدیل کرانے کا فیصلہ کیا اور ذرا پرے جاکر تیئیس سو روپے میں سے ڈیڑھ ہزار روپیہ الگ کر لیا۔ اُن کے پاس گیا تو ایک نے ڈیڑھ ہزار کا ایک ہزار دیا۔ میں نے انکار کر دیا۔ سودا بازی شروع ہو گئی اور ساڑھے بارہ سو روپے لے کر میں نے انہیں ڈیڑھ ہزار روپیہ دے دیا۔ مجھے معلوم ہُوا کہ ۱۹۷۱ء کے شروع میں ہی مشرقی پاکستان کے بنگالیوں نے ہندوستان جانا شروع کر دیا تھا اور ہندوستان کے ہندو کھلے بندوں مشرقی پاکستان جانے لگے تھے۔ لہٰذا کرنسی کے تبادلے کا کاروبار اُسی وقت شروع ہو گیا تھا......

"پیسوں کا مسئلہ حل ہو گیا اور میں ریلوے سٹیشن پر ٹہلنے لگا۔ وہاں بہت ہجوم تھا جو بڑھتا جا رہا تھا۔ اس ہجوم میں دس بارہ آدمی ایسے گھوم پھر رہے تھے جو بنگالی نہیں لگتے تھے۔ وہ ملٹری پولیس یا انٹیلی جنس کے تھے یا سی۔ آئی۔ ڈی پولیس کے سراغرساں تھے۔ وہ سویلین کپڑوں میں تھے۔ ان میں سے ایک تین چار بار میرے قریب سے گزرا اور اُس نے مجھے بڑی غور سے دیکھا۔ مجھے اس کی نظروں سے شک ہو گیا کہ وہ مجھے شک کی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ میں نے اس کی طرف ظاہری طور پر کوئی توجہ نہ دی اور نہ اس سے بچنے یا چھپنے کی کوشش کی۔ گاڑی کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے کلکتہ تک کا ٹکٹ لیا۔ کیونکہ یہ گاڑی کلکتہ تک جاتی تھی میرا ارادہ سیدھا دِلّی تک پہنچنے کا تھا۔ دِلّی سے میں آگے کا پروگرام بنانا چاہتا تھا۔ میں نے یہ پروگرام بنایا کہ کلکتہ سٹیشن پر اُتر کر دِلّی کا ٹکٹ لے لوں گا...... گاڑی میں بھیڑ تھی۔ بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ گاڑی چل

پڑی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سراغرسانوں اور سی آئی ڈی والوں سے چھٹکارا ملا مگر یہ میری خوش فہمی تھی۔ چلتی گاڑی پر ایک آدمی میرے ڈبے میں سوار ہُوا اور دروازے میں کھڑا ہو کر باہر دیکھنے لگا۔ میں نے اُسے دیکھا تو دل بیٹھ گیا۔ یہ وہی آدمی تھا جو مجھے پلیٹ فارم پر گھور گھور کر دیکھتا رہا تھا.....

"گاڑی تیز ہو گئی تو یہ آدمی دروازے سے ہٹا اور میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دو آدمیوں کے درمیان بیٹھ گیا۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس سے نظریں بچانے کی کوشش نہ کی۔ میں مسکرایا تو وہ بھی مسکرایا۔ میں نے پوچھا —— 'آپ کہاں جا رہے ہیں؟' —— اُس نے بتایا کہ کلکتہ جا رہا ہے۔ میں نے پوچھا —— 'یہاں کسی کام سے آئے تھے؟' —— اُس نے کہا کہ یہاں ایک ذاتی کام تھا۔ ہم اُردو میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اُسے کہا —— 'آپ کلکتہ کے رہنے والے معلوم نہیں ہوتے۔ آپ بنگالی تو نہیں۔'....

'آپ بنگالی ہیں؟' اس نے مجھ سے پوچھا۔ 'یہاں کیسے آئے تھے؟ آپ کا نام کیا ہے؟'.....

"میں بنگالی لب ولہجے میں اُردو بول رہا تھا تاکہ کسی کو شک نہ ہو کہ میں غیر بنگالی ہوں۔ میں نے بنگالی اُردو میں جواب دیا —— 'میں کلکتہ کا رہنے والا ہوں۔ پیدائشی بنگالی ہوں۔ میرا نام سبھاش چندر ہے۔ میں یہاں بن گاؤں میں نہیں آیا تھا۔ میں بنگلہ دیش سے آ رہا ہوں۔ مکتی باہنی کے لئے کچھ سامان لے کے گیا تھا۔ جنگ ختم کر کے آیا ہوں۔' میں نے اسے بھی وہی افسانے سنانے شروع کر دیئے جو ہلّی اور لبو گرام کے درمیان ہندوستانی فوجیوں کو سنائے تھے۔ میں نے پاکستان کو بُرا بھلا کہا۔ ہندوستانی فوج کی بہادری کی تعریفیں کیں اور جھوٹ موٹ کا آنکھوں دیکھا حال سنایا مگر میں اس آدمی کی نظروں سے پہچان رہا تھا کہ اُسے میری باتوں پر یقین نہیں آ رہا اور اسے مجھ پر شک ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ مکتی باہنی کے لئے آپ کیا سامان لے کر گئے تھے؟ میں نے اسے جواب دیا —— 'یہ کسی سویلین کو تو نہیں بتا سکتا'

کوئی فوجی افسر پوچھے تو اُسے بھی نہیں بتاؤں گا، اُسے یہ بتانے کے لئے کہ میں واقعی بنگالی ہوں، میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے بنگالی کے ساتھ بنگالی زبان میں باتیں شروع کر دیں۔ گاڑی میں ہر کسی کا موضوع جنگ اور بنگلہ دیش تھا۔ میں نے بلند آواز سے بنگلہ دیش کی باتیں شروع کر دیں۔ قریب بیٹھے ہوئے مسافر میری طرف متوجہ ہوئے۔ میں نے پاکستان کے خلاف اسی قسم کی باتیں شروع کر دیں جیسی پہلے کر چکا تھا.....

"گاڑی کلکتہ سٹیشن پہ رکی۔ میں سراغرساں سے ہاتھ ملا کر سٹیشن سے باہر نکلا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ بھوک نے پریشان کر رکھا تھا۔ میں ٹیکسی میں جا بیٹھا اور چورنگی جا اُترا۔ وہاں کوئی مسلمان ہوٹل دیکھنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے ایک درمیانہ درجے کا مسلمان ہوٹل نظر آ گیا۔ اندر گیا۔ اطمینان سے کھانا کھایا۔ اور لوگ بھی بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ باہر فتح کی خوشیاں اور ہنگامے تھے۔ 'پاکستان مردہ باد اور جے بنگلہ' کے نعرے تھے۔ ہندو ناچ رہے تھے مگر مسلمان ہوٹل کے اندر ماتم کا سکوت طاری تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے یہ چند ایک مسلمان سر جھکائے ہوئے تھے۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔ ایک کونے میں ایک سفید ریش بنگالی بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا اور آنسو پونچھ رہا تھا۔ جس بیرے نے میرا آرڈر لیا اُس نے غم سے بوجھل آواز میں بتایا کہ کیا پکا ہے اور جب میں نے بتایا کہ میں کیا کھاؤں گا تو وہ آہ بھر کر چلا گیا۔ اچانک بہت سے ہندو نوجوانوں کا ایک ٹولا ہوٹل کے سامنے آ کر ناچنے اور چیخنے لگا۔ وہ لوگ پاکستانی فوج کو گالیاں دے رہے تھے۔ میرا خون اس قدر کھولا کہ میرا ہاتھ اپنی پنڈلی تک چلا گیا جہاں میں نے ریوالور باندھ رکھا تھا لیکن عقل نے ساتھ دیا اور میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ میں نے ہوٹل میں نظر دوڑائی۔ سب کی آنکھیں لال سرخ تھیں مگر سب مجبور اور بے بس تھے.....

"میں نے جلدی جلدی کھانا زہر مار کیا اور پیسے دے کر باہر نکل گیا۔ میں ہوٹل کی اداس اور شکست خوردہ فضا سے بھاگا تھا مگر باہر خوشیوں کا جو ہنگامہ تھا اس نے میری ایسی حالت کر دی جیسے کسی نے مجھے سمندر میں پھینک دیا ہو۔ میں سر جھکا

کر چل پڑا۔ میں نے ابھی سوچا نہیں تھا کہ کہاں جاؤں۔ چند قدم آگے گیا تو پیچھے سے آواز آئی ــــ 'مسٹر سبھاش چندر' ــــ میں نے گھوم کے دیکھا۔ وہی سراغرساں تھا جس نے میرے ساتھ سفر کیا تھا.....

"آپ کھانا مسلمانوں کے ہوٹل میں کھایا کرتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"میرے دماغ میں ایک بات آ گئی مگر مجھے زیادہ سوچنے کا موقعہ نہ ملا۔ میں نے کہا ــــ 'دیکھو مسٹر! میں اُسی ڈیوٹی پر ہوں جس پر تم ہو۔ میں نے اس ہوٹل میں کھانا نہیں کھایا۔ مجھے شہر کے تمام مسلمان ہوٹلوں میں مسلمان بن کر جانا ہے اور یہ رپورٹ دینی ہے کہ ڈھاکہ کے فال کے متعلق یہاں کے مسلمانوں کا ردِعمل کیا ہے۔ تم اپنی ڈیوٹی کرو۔ مجھے اپنی ڈیوٹی کرنے دو اور سنو۔ میرا نام سبھاش چندر نہیں ہے۔ میں تمہاری رپورٹ بھی لکھ دوں گا کہ تم غلط آدمیوں کے تعاقب میں وقت ضائع کر رہے ہو'.....

"آپ ملٹری پولیس کے ہیں یا سول پولیس کے؟" اس نے کہا ــــ 'مجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ اس علاقے میں کون کون یہ ڈیوٹی دے رہا ہے...... آپ میرا شناختی کارڈ دیکھ لیں اور مجھے اپنا دکھا دیں۔'

"اس جھوٹ کا میں نے یہ پہلو نہیں سوچا تھا۔ میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ زیادہ تجربہ کار معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور معلوم نہیں اس نے کیا اشارہ کیا کہ سڑک کے ساتھ ایک پارک تھا، اس کے ایک درخت کے پیچھے سے دو پولیس کانسٹیبل آ گئے۔ ایک میرے دائیں اور ایک بائیں کھڑا ہو گیا۔ سراغرساں نے رازداری سے پوچھا۔ 'دیکھو دوست! آؤ سیدھی سیدھی باتیں کریں۔ کہاں سے آئے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟' ــــ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے کہا ــــ 'گھبراؤ نہیں بات کرو'.....

"مجھے یاد آ گیا کہ ۱۹۴۷ء میں پولیس کے ایک کانسٹیبل کو رشوت دے کر کلکتے سے نکلا تھا۔ یہ بھی رشوت کا ہی چکر معلوم ہوتا تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ آؤ

پارک میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ وہاں گئے تو میں نے اُسے بتا دیا کہ میں مسلمان ہوں اور مشرقی پاکستان سے نکل کر آیا ہوں۔ اب مغربی پاکستان جانے کا ارادہ ہے۔ میں نے اُن سے پوچھا — ’بتاؤ۔ کیا لو گے؟ مجھے کلکتے سے نکل جانے دو‘۔

’جتنے پیسے ہیں دے دو‘۔ اس نے کہا۔

’میں صرف پانچ سَو دوں گا‘۔ میں نے جواب دیا۔ ’میرے پاس کل آٹھ سو روپے ہیں‘۔

’تمہارے پاس زیادہ رقم ہے‘۔ اُس نے کہا۔

”میں نے کہا کہ چلو ایک ہزار ہو گی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ میں نے بن گاؤں میں نوٹ تبدیل کرنے والوں سے دُور ہٹ کر جیب سے ساری رقم نکالی اور اس میں سے ڈیڑھ ہزار روپیہ الگ کیا تھا تو اُس وقت اس نے ساری رقم دیکھ لی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تمہارے پاس تین چار ہزار روپیہ ہے۔ اس میں سے صرف ایک سو روپیہ رکھ لو اور باقی ہمارے حوالے کر دو۔ مجھے طیش آ گیا۔ اس طیش میں میں یہ بھی بھول گیا کہ میری ٹانگ کے ساتھ ریوالور بندھا ہوا ہے جس کا میرے پاس لائسنس بھی نہیں۔ میں نے اسے کہا کہ چلو مجھے پولیس سٹیشن لے چلو۔ میں جاسوس یا سمگلر تو نہیں۔ صاف بتا دوں گا کہ یہ میرے پاس رقم ہے اور میں جنگ کے خوف سے بھاگ کر یہاں آ گیا ہوں...... میرا یہ فیصلہ بڑا ہی غلط اور خطرناک تھا۔ یہ نتیجہ تھا طیش میں سوچنے کا۔ ایک کانسٹیبل نے مجھے دھکیل کر کہا — ’چلو بیٹا! پولیس سٹیشن کا بھی مزہ چکھ لو‘۔

”وہ مجھے سڑک پر لے آئے۔ کلکتے میں ٹرامیں چلتی ہیں۔ گلیوں میں بھی جاتی ہیں۔ کلکتے کی ٹرامیں نہایت اچھی ہوتی ہیں۔ انہوں نے مجھے ایک ٹرام میں بٹھایا۔ میں دروازے کے ساتھ بیٹھا۔ ایک کانسٹیبل سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ایک میرے پہلو میں اور سراغرساں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ٹرام چل پڑی۔ میری عقل ٹھکانے آنے لگی اور میں سوچنے لگا کہ انہیں ایک ہزار روپے پر راضی کر لوں ورنہ تھانے میں ساری رقم چھن جائے گی۔ اچانک ریوالور کا خیال آ گیا۔ میرا پسینہ نکل آیا۔ یہ بہت بڑا جرم تھا۔

میں اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے کانسٹیبل سے کہنے ہی لگا تھا کہ ایک ہزار روپیہ لے لو اور میری جان بخشی کر دو کہ ٹرام رُک گئی اور لوگوں کا ایک ہجوم ٹرام پر ٹوٹ پڑا۔ اس قدر لوگ کہ بہت سے ہمارے اُوپر گرے اور ٹرام چل پڑی۔ دو آدمی دوسرے آدمیوں کے بوجھ سے اور دھکوں سے جُھک کر میرے اور کانسٹیبل کے درمیان ہو گئے۔ سامنے والا کانسٹیبل بھی مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ساتھ والا کانسٹیبل بھی مجھ سے الگ ہو گیا تھا۔ میری عقل نے ایک راستہ سوچ لیا......

”ٹرام تیز ہوئی اور تھوڑی دُور جا کر رکنے کے لئے آہستہ ہونے لگی۔ میں دروازے کے ساتھ ہی تھا۔ میں نے اپنے اوپر جھکے ہوئے ایک آدمی کو اشارہ کیا کہ وہ میری جگہ بیٹھ جائے۔ وہ بیٹھنے کو جُھکا۔ میں آہستہ سے سرکا۔ پائیدان پر پاؤں رکھا اور دوسرے لمحے میں سڑک پر ٹرام کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ سات آٹھ قدم دوڑ کر سنبھل گیا۔ ٹرام آگے نکل گئی۔ آگے سے دوسری پٹڑی پر ٹرام آ رہی تھی۔ میں دوڑ کر اس میں سوار ہو گیا اور دونوں ٹرامیں ایک دوسری سے بہت دور ہو گئیں۔ میں اُس ٹرام کو دیکھتا رہا۔ وہ تقریباً ایک سَو گز آگے جا کر رُکی۔ میرے والی ٹرام بھی رُکی اور مسافروں کو اُتار اور چڑھا کر چل پڑی۔ میری نظر پیچھے تھی مگر ٹرام گھوم گئی۔ میں تین چار سٹاپ آگے جا کر اُترا اور بہت تیز چلتا کوئی مسجد تلاش کرنے لگا۔ مجھے ایک مسلمان ہوٹل نظر آ گیا۔ میں اسی میں گھس گیا۔ وہاں بھی بہت سے مسلمان کھانا کھا رہے تھے۔ میں سب کے چہروں کا جائزہ لینے لگا۔ ایک آدمی مجھے نظر آیا جو زیادہ معزز لگتا تھا۔ میں اُس کے پاس جا بیٹھا۔ ظاہر ہے موضوع مشرقی پاکستان تھا......

”پاکستان کے معاملے میں وہ مجھ سے زیادہ جذباتی تھا۔ اس کے آنسو دیکھے تو میں نے اسے اعتماد میں لے کر اپنے متعلق بتا دیا کہ میں بیوی بچوں کو ڈھاکہ میں چھوڑ کر کس طرح مشرقی پاکستان سے نکلا ہوں، اور اب کس طرح سی۔ آئی۔ ڈی کی حراست سے فرار ہو آیا ہوں۔ میں نے اُسے سارا واقعہ سُنا دیا اور اسے بتا دیا کہ میرے پاس ریوالور اور دو ہزار سے زیادہ رقم ہے۔ اس نے کہا۔ ’سورج غروب ہو گیا ہے۔ ذرا اور اندھیرا

ہو لینے دیں۔ میں آپ کو گھر لے چلوں گا۔"۔۔۔

"شام تاریک ہونے لگی تو وہ باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد آیا اور مجھے اشارہ کر کے ہوٹل کے اندرونی حصّے کی طرف چل پڑا۔ میں اس کے پیچھے گیا۔ اُدھر پچھلا دروازہ تھا۔ باہر نکلے تو ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ اُس نے مجھے ٹیکسی میں بٹھایا اور ٹیکسی چل پڑی۔ پندرہ بیس منٹ بعد میں اس کے ساتھ اُس کے گھر میں داخل ہوا اور اس نے مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ اس نے کہا ۔۔۔ "میں آپ کے نہانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ پہلے آرام کر لیں، پھر سوچیں گے کہ کیا کیا جائے۔"۔۔۔

"میں نہانے کے لئے غسل خانے میں گیا اور جب دروازہ بند کیا تو میں اچانک اس طرح ڈر گیا جیسے مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا ہو۔ یہ ڈراؤنا سا خیال آ گیا کہ میں نے اس آدمی پر کیوں اعتماد کیا ہے۔ اس کے متعلق مجھے صرف اتنا ہی یقین تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ وہ پولیس کی خوشنودی کے لئے مجھے پکڑوا سکتا تھا۔ مجھے اپنی ایک سنگین غلطی کا احساس ہوا۔ وہ یہ کہ میں اپنی ٹانگ کے ساتھ بندھا ہوا ریوالور اُس کے حوالے کر آیا تھا اور جیکٹ بھی کمرے میں اتار کر رکھ دی تھی۔ میری ساری رقم اُس کی جیب میں تھی۔ میں اب نہتّہ تھا۔ کنگال بھی تھا اور شاید قیدی بھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ میں اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال چکا تھا۔ غسل خانے میں جا کر میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ ہندوستان کے مسلمان ہندوؤں کے غلام ہیں۔ ان کی اپنی کوئی شخصیت نہیں رہی اور ان کے لئے فائدہ مند صورت یہی ہوتی ہے کہ ہندوؤں کو خوش رکھیں۔ مجھے یہ یقین ہونے لگا کہ مجھے غسل خانے میں داخل کر کے یہ آدمی پولیس کو اطلاع دینے چلا گیا ہے۔"۔۔۔

"میں بہت تیزی سے نہا کر غسل خانے سے نکل آیا۔ میں یہ سوچ کر نکلا تھا کہ کوئی خطرہ ہوا تو نکل بھاگوں گا اور اگر مقابلہ کرنا پڑا تو کروں گا۔ مر جاؤں گا، قید نہیں ہوں گا۔ میں کمرے میں گیا تو وہاں ریوالور بھی نہیں تھا اور جیکٹ بھی نہیں تھی۔ شاید دو منٹ گزرے ہوں گے کہ میرا میزبان کمرے میں آیا۔ مگر یہ دو منٹ دو گھنٹوں کے برابر تھے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک پاجامہ اور کرتا تھا۔ ہنس کر بولا ۔۔۔ "یہ آپ کے سائز کے تو نہیں لیکن مجبوری ہے"۔ میں نے یہ کپڑے پہنے تو تنگ نکلے۔ بہرحال پہن لئے۔ وہ مجھے ایک اور کمرے میں لے گیا۔ میری جیکٹ کھونٹی سے لٹک رہی تھی۔ اس نے پلنگ سے تکیہ اٹھایا۔ اس کے نیچے میرا ریوالور

تھا لیکن وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھا۔ میں پلنگ پر اور وہ کرسی پہ بیٹھ گیا۔ ابھی کوئی بات شروع نہیں ہوئی تھی کہ ایک ضعیف العمر بزرگ، داڑھی دودھ کی مانند سفید اور سر رعشہ گیر، کمرے میں آئے۔ میزبان نے تعارف کرایا ـــ "میرے والد صاحب ہیں"ـــ میں اٹھ کر اور ان کے گھٹنے چھو کر انہیں ملا.....

"او بزدلو"ـــ بوڑھے نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ـــ "اپنا ملک ہندوؤں کو دے آئے ہو بے غیرتو"ـــ اس کے ساتھ ہی اس بزرگ کی ہچکیاں نکل گئیں۔ بچہ کھلونا ٹوٹنے پر کیا روتا ہوگا۔ میں نے روتے دیکھا تو اس بزرگ کو دیکھا۔ میرے آنسو بہنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد بزرگ نے طنزیہ لہجے میں کہا ـــ "تم اب بھاگتے پھر رہے ہو؟ وہاں مر کیوں نہیں گئے؟ ہم تو مجبور رہیں۔ ہندوستان میں رہتے ہیں۔ بدبختو، تم آزاد تھے"ـــ انہوں نے مجھے، پاکستانیوں کو اور پاکستان کے حکمرانوں اور پاکستان کی فوج کو سخت جلی کٹی سنائیں جو میں نے خاموشی سے سنیں۔ جب ان کا غم و غصہ ذرا کم ہوا تو میں نے انہیں بتایا کہ مشرقی پاکستان میں کیا ہوتا رہا ہے اور یہ شکست ہماری کون سی غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ بزرگ نے بڑے ہی دکھ سے مجھے سنایا کہ انہوں نے پاکستان کس طرح بنایا تھا۔ انہوں نے کہا ـــ "سن چھیالیس میں میری عمر پچاس سال تھی۔ یہی کلکتہ تھا جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی، لیکن ہم نے ان کا یہ حال کر دیا تھا کہ وہ مسلمان کا نام سن کر ہی ڈر جاتے تھے۔ آج ان کافروں نے انتقام لے لیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ تم مغربی پاکستان بھی ہندوستان کو دے بیٹھو گے"......

"میں اپنے ان میزبانوں کے نام نہیں بتا سکتا۔ یہ بزرگ الٰہ آباد کے رہنے والے تھے۔ جوانی کی عمر میں کلکتہ میں نوکری کی تلاش میں آئے تھے۔ نوکری مل گئی۔ ایک مسلمان بنگالی لڑکی کے ساتھ راہ و رسم پیدا ہو گئی جو محبت کی صورت اختیار کر گئی۔ انہوں نے شادی کر لی۔ والدین کو اطلاع دی تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ بنگالن کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔ انہوں نے الٰہ آباد میں ان کے لئے ایک رشتہ

پکا کر رکھا تھا۔ یہ بزرگ واپس گئے ہی نہیں۔ یہ ۱۹۲۳ء کا واقعہ ہے۔ پاکستان بنا تو کلکتہ میں ان کا کاروبار بہت پھیل چکا تھا۔ ان کا یہ بیٹا جو مجھے ہوٹل سے گھر لایا تھا اُس وقت بیس سال کا تھا۔ وہ مشرقی پاکستان ہجرت کر جانا چاہتا تھا لیکن اس کا باپ اتنا اچھا کاروبار ہندوؤں کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے ہندوؤں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا اور کلکتہ میں ہی رہا لیکن دل میں پاکستان کی محبت کو ہمیشہ زندہ رکھا۔ انہیں اب پہلی بار پاکستان کی ذرا سی خدمت کرنے کا یہ موقع ملا کہ ایک مفرور پاکستانی کو جس کے تعاقب میں ہندوستان کی فوج اور پولیس تھی، پناہ دی اور وہ سوچنے لگے کہ مجھے ہندوستان سے کس طرح نکال کر مغربی پاکستان پہنچائیں.....

"میرے پاس تو صرف دلیری تھی اور یہ جذبہ کہ ہندوستانیوں کا قیدی نہیں بنوں گا، لیکن اس قابل صد احترام بزرگ کے پاس عقل و دانش کا بے پناہ ذخیرہ تھا۔ انہوں نے پہلی بات یہ کہی کہ وہ مجھے کم از کم پندرہ دن گھر سے باہر نہیں نکلنے دیں گے۔ دوسری بات یہ کہی کہ میں اب شیو کرنی چھوڑ دوں۔ وہ میرا حلیہ بدلنا چاہتے تھے۔ اُس وقت ہم میں سے کسی کے ذہن میں نیپال نہ آیا۔ یہ بعد کی بات ہے کہ مشرقی پاکستان کے مسلمان بنگالیوں نے غیر بنگالیوں کو وہاں سے سمگل کر کے نیپال میں داخل کرنا شروع کیا تھا۔ میرے لئے یہی ایک راستہ تھا کہ ہندوستان میں سے گزر کر مغربی پاکستان تک پہنچا جائے مگر خطرہ یہ تھا کہ وہاں بھی جنگ ہوئی تھی اور دونوں طرف کی فوجیں سرحد پر مورچوں میں تھیں۔ یہی ایک رکاوٹ تھی اور مجھے یہ خطرہ نظر آ رہا تھا کہ فوجوں کی واپسی تک ہندوستان میں ہی کہیں رکے رہنا پڑے گا۔ میرے میزبانوں نے مجھے ان کے گھر میں رہنے کا مشورہ دیا مگر وہاں رہنا اس وجہ سے خطرناک تھا کہ ملٹری پولیس اور سول پولیس بھی مجھے دیکھ چکی تھی۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کے مفرور غیر بنگالی مسلمان کلکتہ اور اس کے گرد و نواح میں آ رہے تھے، اس لئے وہاں کی پولیس پکڑ دھکڑ میں سرگرم تھی.....

"ہم آدھی رات تک غور کرتے رہے۔ آخر اس نتیجے پہ پہنچے کہ وہ مجھے اپنے

ایک دوست کا پتہ دے کر بھیج دیں گے جو مغل سرائے میں رہتا ہے۔ مغل سرائے ہندوستان کا ایک بہت بڑا ریلوے سٹیشن ہے جو دلّی اور کلکتہ کے تقریباً درمیان میں واقع ہے۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ مجھے پندرہ بیس روز بعد روانہ کیا جائے گا تاکہ پولیس میری تلاش سے دستبردار ہو جائے اور میری داڑھی بھی بڑھ آئے..... اس فیصلے کے مطابق میں وہیں رہنے لگا۔ یہ ایک قسم کی قید تھی۔ میں ایک منٹ کے لئے بھی باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ دن بھر اس بزرگ کے ساتھ گپ شپ چلتی رہتی تھی اور جب میں تنہا ہوتا تھا تو اپنے بیوی بچوں کا غم بے حال کر دیتا تھا۔ دعا کے سوا میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ صرف امید مجھے سہارا دیتی تھی مگر مکتی باہنی کی درندگی یاد آتی تھی تو دل دہل جاتا تھا اور امید مر جاتی تھی۔ کبھی کبھی تو میں اس حقیقت کو قبول کر لیتا تھا کہ میرا سارا کنبہ مشرقی پاکستان پر قربان ہو گیا ہے۔ میں تصوّروں میں ان کی لاشیں دیکھا کرتا تھا۔ امید کو ذرا سا سہارا یہ ملتا تھا کہ میں انہیں بنگالی دوستوں کی پناہ میں چھوڑ آیا تھا مگر یہ امید بھی یہ سوچ کر ٹوٹ جاتی تھی کہ میرے یہ بنگالی دوست بھی اس جرم میں مارے گئے ہوں گے کہ انہوں نے غیر بنگالیوں کو پناہ دے رکھی ہے.....

"تنہائی میں ایسے ہی الٹے سیدھے خیال پریشان رکھتے تھے۔ یہ پریشانی بعض اوقات ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی۔ میں نے اس سے بچنے کا یہ طریقہ سوچا کہ اپنے سفر پر روانہ ہو جاؤں۔ میں بھاگتا رہوں اور پولیس میرا پیچھا کرتی رہے تاکہ میں فرار کے سوا اور کچھ سوچ ہی نہ سکوں۔ سات آٹھ روز بعد میری داڑھی اتنی سی بڑھ آئی کہ چہرہ چھپ گیا۔ میں نے اپنے میزبانوں سے کہا کہ میں اللہ کا نام لے کر چل پڑتا ہوں لیکن انہوں نے اجازت نہ دی۔ اس دوران وہ مجھے مشرقی پاکستان کی وہ خبریں سناتے رہے جو اخباروں میں شائع نہیں ہوتی تھیں بلکہ یہ مشرقی پاکستان سے آنے والے زبانی سناتے تھے۔ یہ خبریں بھیانک تھیں۔ بڑی ہی ہولناک تھیں۔ ہر روز یہ سننے میں آتا تھا کہ مکتی باہنی کے بنگالی محبّ

وطن پاکستانیوں کو سرِعام قتل کر رہے ہیں اور یہ قتل تماشہ بنا ہوا ہے۔ یہ خبریں بھی ملیں کہ غیر بنگالی شہری آبادی کو کیمپوں میں جمع کر کے جنگی قیدیوں کی حیثیت سے ہندوستان لایا جا رہا ہے۔ میری جذباتی حالت ان خبروں سے بگڑنے لگی۔ میں نے فراغت اور تنہائی سے بچنے کے لئے میزبانوں سے کہا کہ وہ مجھے نکل جانے دیں....

"وہ سولھواں روز تھا۔ میرے پاس بارہ سو روپیہ ہندوستانی تھا جو میں نے ڈیڑھ ہزار روپیہ پاکستانی دے کر لیا تھا۔ ابھی میرے پاس آٹھ سو روپیہ پاکستانی تھا۔ میرے میزبان نے مجھے اس کے عوض آٹھ سو روپیہ ہندوستانی دے دیا۔ میرے لئے نہایت اچھے کپڑے کا پاجامہ اور کرتہ سلوایا اور ایک قیمتی کمبل خرید لائے۔ مجھے ان کپڑوں میں فرار ہونا تھا۔ انہوں نے مجھے ایک اٹیچی کیس بھی دیا۔ میں نے اس میں اپنی پتلون قمیض اور جیکٹ ڈال لی۔ ریوالور بھی اسی میں رکھ لیا۔ شام ساڑھے آٹھ بجے ٹیکسی آگئی۔ میرا میزبان ریلوے سٹیشن تک میرے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن میں نے اُسے یہ کہہ کر روک دیا کہ اگر مجھے کسی نے پہچان کر پکڑ لیا تو وہ بھی مصیبت میں پھنس جائے گا۔ میں اپنی خاطر اسے کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ انہوں نے مغل سرائے والے دوست کے نام رقعہ لکھ دیا اور اتا پتہ اچھی طرح سمجھا دیا۔ میں ان سے رخصت ہوا تو اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا....

"ٹیکسی ریلوے سٹیشن تک لے گئی۔ وہاں بہت رش تھا۔ میں نے مغل سرائے کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خریدا۔ فسٹ یا سکینڈ کلاس میں رش نہ ہونے کی وجہ سے پہچانے جانے کا خطرہ تھا۔ ٹکٹ لے کر میں پلیٹ فارم کی طرف چلا تو ایک بنگالی نے مجھے روک لیا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ ایک ہندو تاجر تھا۔ ڈھاکہ میں اُس کی کمیشن ایجنسی تھی۔ میرا اس کے ساتھ بڑا گہرا اور لمبے عرصے کا کاروباری تعلق تھا۔ اس بدبخت نے مجھے اس بدلے ہوئے حلیے میں بھی پہچان لیا۔ مجھے امید تھی کہ داڑھی میں مجھے کوئی نہیں پہچان سکے گا اور ملٹری انٹیلی جنس کا دو آدمی [illegible]

— مجھے پہچان ہی نہیں سکے گا جس کی حراست سے میں ٹرام سے بھاگا تھا مگر اس ہندو نے مجھے داڑھی میں بھی پہچان لیا۔ تب مجھے محسوس ہوا کہ پندرہ دنوں میں داڑھی بمشکل ایک انچ بڑھی ہے جو حلیہ تبدیل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اس ہندو نے (جو ڈھاکہ منڈی میں بی کے داس کے نام سے مشہور تھا) مجھے فوراً پہچان لیا اور میرے دونوں کندھے تھام کر کہا — "رئیس سیٹھ تم بھی ادھر آ گیا ہے" — اس نے بظاہر خوشی کا اظہار کیا۔ میں بوکھلا گیا۔

"مجھے سوچنے کی مہلت ہی نہ ملی کہ میں کیا کروں۔ میں نے حیران سا ہو کے اُردو میں کہا "آپ کو غلطی لگی ہے۔ میں رئیس سیٹھ نہیں ہوں۔ میرا نام بدرالحق ہے"....

"تم ڈھاکہ سے نہیں آیا؟" — اس نے پوچھا — "ہم کو نہیں جانتا؟ ہم بی کے داس ہوں۔ داڑھی کب رکھا؟"....

"مجھے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ مجھے بتا دینا چاہیئے تھا کہ میں رئیس الدین ہی ہوں مگر میں ہندو کو اعتماد میں نہیں لے سکتا تھا۔ بہرحال میں فیصلہ نہ کر سکا کہ بتا دینا اچھا تھا یا جو جھوٹ بولا تھا وہ بہتر ہے۔ میں نے اسے کہا "آپ ضرور بی کے داس ہوں گے لیکن میں رئیس سیٹھ نہیں ہوں۔ میں مغل سرائے سے آیا ہوں۔ وہیں واپس جا رہا ہوں۔ میں ڈھاکہ کبھی نہیں گیا" — میں اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر پلیٹ فارم پر چلا گیا....

"باوردی ملٹری پولیس کے کئی آدمی اس بھیڑ میں گھوم پھر رہے تھے ان میں سی آئی ڈی کے بغیر وردی آدمی بھی ضرور ہوں گے۔ گاڑی کھڑی تھی۔ روانگی میں تھوڑا سا وقت رہ گیا تھا۔ تھرڈ کلاس کے ڈبوں میں بہت رش تھا۔ میں جگہ دیکھتا پھر رہا تھا ایک ڈبے میں سوار ہونے لگا تو پیچھے سے میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھ کر پیچھے کو کھینچا۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ ملٹری پولیس کا ایک حوالدار تھا۔ اس کے ساتھ ایک لانس نائک تھا۔ وہ یقیناً ہندو تھے۔ حوالدار نے سر سے اشارہ کیا کہ میں ان کے

ساتھ چلوں۔ پیچھے سے لانس نائک نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر دبایا۔ میں گھبرایا تو ضرور لیکن رک کر پیچھے دیکھا اور لانس نائک کو رعب سے کہا "دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟ دھکا مت دو" — حوالدار نے بھی اسے ڈانٹ دیا۔ وہ مجھے مسافروں کے رش سے الگ لے گئے....

"آپ کا نام؟" حوالدار نے پوچھا۔

"میں سمجھ گیا کہ یہ بی کے داس کی شرارت ہے۔ میں نے اسے اپنا نام بدرالحق بتا کر گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر یہ ہندو گمراہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے حوالدار کو بھی اپنا نام بدرالحق بتایا اور اسے کہا "میں مغل سرائے سے آیا ہوں اور اب واپس جا رہا ہوں" — اتنے میں ایک طرف سے بی۔ کے داس نمودار ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر شیطانوں والی مسکراہٹ تھی۔ میرا پول کھل چکا تھا....

"سنو رئیس الدین" — حوالدار نے کہا "اگر تم نام صحیح بتا دیتے تو ہم تم پر کوئی شک نہ کرتے۔ تم نے انہیں (بی کے داس کو) اپنا نام غلط بتا کر اور جھوٹ بول کر اپنے خلاف شک پیدا کیا ہے۔ تم ڈھاکہ سے آئے ہو۔ جھوٹ کیوں بولا ہے؟ اس اٹیچی کیس میں کیا ہے؟ کھول کر دکھاؤ"....

"میرا رُواں رُواں بیدار ہو گیا۔ اٹیچی کیس میں دو خطرناک چیزیں تھیں۔ ایک ریوالور جس کا لائسنس پاکستانی تھا اور وہ بھی میرے پاس نہیں تھا۔ دوسرا وہ خط تھا جو مجھے میزبانوں نے اپنے مغل سرائے والے دوست کے نام لکھ دیا تھا۔ اس کے چند ایک فقرے انہیں مصیبت میں گرفتار کرانے کے لئے کافی تھے، مثلاً یہ "انہیں (مجھے) مغربی پاکستان کی سرحد تک پہنچانا آپ کا کام ہے.... ہم ان ہندوؤں کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ ایک مصیبت زدہ پاکستانی کو ہندو راج سے نکالنا ہمارا فرض ہے" — اور ایسے چند اور فقرے تھے جو ملٹری پولیس کے ہاتھ چڑھ جاتے تو میرے میزبانوں کو ہندو مقدمہ چلائے بغیر جیل خانے میں ڈال دیتے۔ ان کا کاروبار

تباہ ہو جاتا، ان کی حیثیت اور ان کی عزت ختم ہو جاتی اور ان کے ساتھ وہ معزز مسلمان تاجر بھی گرفتار ہو جاتا جس کے پاس میں یہ رقعہ لے جا رہا تھا...... میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اپنی جان دے دونگا، یہ ملٹری پولیس کو نہیں دیکھنے دوں گا۔ اب مجھے اپنے ان محسنوں کی خاطر قربانی دینی تھی.....

"حوالدار صاحب!" میں نے بارعب لہجے میں کہا ــ "میں نہیں سمجھ سکتا کہ تمہارے دماغ میں کیا ہے۔ میں تمہیں اس اٹیچی کیس کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دوں گا۔ اپنے کسی آفیسر کو بلا لاؤ"

"ارے چپ رہو" ــ حوالدار نے کہا ــ "ہمارے آفیسر تمہاری آرمی کے آفیسروں کی طرح ہتھیار ڈالنے والے نہیں ہیں۔ وہ کسی مسلمان کے بلانے پر نہیں آئیں گے۔ تم ان کے پاس جاؤ گے".....

"رئیس سیٹھ" ــ بی کے داس نے کہا ــ "جھوٹ کیوں بولتے ہو؟ بتا دو میں ڈھاکہ سے آیا ہوں اور جان چھڑاؤ".....

"ان دونوں نے میرا خون گرما دیا۔ ہتھیار ڈالنا ایسا طعنہ تھا جو میری برداشت سے باہر تھا۔ غصے سے میری مٹھیاں بند ہو گئیں لیکن عقل نے میرے غصے پر قابو پا لیا۔ مجھے اب ان دونوں کی حراست سے بھی فرار ہونا تھا جو مجھے ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ داس ہندو تھا۔ اُس نے ڈنگ مار دیا تھا۔ اٹیچی کیس میرے ہاتھ میں تھا۔ داس نے دوستانہ انداز سے ہنس کر ہاتھ اٹیچی کیس پر رکھا اور کہا ــ

"یہ ہمارے بہت دوست ہیں حوالدار صاحب! یہ لو، ان کا اٹیچی کیس دیکھ لو".....

"میں نے اٹیچی کیس پیچھے کر کے بڑے زور سے ہاتھ اس کے ہاتھ پر مارا اور غصے میں گرج کر کہا ــ "ہاتھ پیچھے رکھو۔ سنو حوالدار، چلو، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ اس اٹیچی کیس میں کپڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے لیکن تمہیں نہیں دکھاؤں گا۔ کم از کم کرنل رینک کے آفیسر کو کھولنے دوں گا۔ پھر تم ساری عمر پچھتاتے رہو گے کہ تم نے اٹیچی کیس کیوں کھلوایا تھا۔ تمہارا کورٹ مارشل نہ کرا

دوں تو کہنا"

"میری جھوٹی دھونس کا کچھ نہ کچھ اثر ہوا لیکن بی کے داس کو سو فیصد یقین تھا کہ میں بدر الحق نہیں، رئیس الدین ہوں اور میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ حوالدار نے داس سے کہا ــ "تم سن لو سیٹھ! اب بھی سوچ لو۔ میں نے اسے تمہاری رپورٹ پر پکڑا ہے اگر میرے آفیسر کے سامنے جا کر میری بے عزتی ہوئی تو میں تمہیں کوارٹر گارد میں بند کر دوں گا".....

ہندو، خصوصاً بنگالی ہندو بڑا ہی ڈھیٹ اور ہٹ دھرم ہوتا ہے صبح شام جوتے کھاتا رہے گا، اصل بات پر نہیں آئے گا۔ یہی حال بی کے داس کا تھا۔ اس نے حوالدار سے کہا ــ "میں نے تمہیں بتایا تھا کہ یہ شخص پاکستان کی فوج کو سامان سپلائی کرتا تھا۔ اس نے اپنا بال بچہ کہیں غائب کر دیا تھا۔ پھر یہ اپنی فوج کے ساتھ رہا۔ میں نے تمہیں ساری بات بتائی ہے۔ اب تمہیں یہ بتاتا ہوں کہ یہ اُدھر سے گرفتاری سے بھاگ کر آیا ہے۔ اس کے اٹیچی کیس میں رقم اور سونا ہے۔ یہ مال مغربی پاکستان جا رہا ہے۔ یہ میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم سمجھ گئے ہو گے لیکن تم نہیں سمجھتے".....

"رقم اور سونا" ــ حوالدار کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر للچائی ہوئی مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا ــ "رقم اور سونا"..... ہے بھائی؟ سونا؟ زیورات ہوں گے؟ ــ اس نے دوستانہ لہجے میں کہا ــ "ہمیں دکھا دو۔ قسم لے لو، تمہیں اپنے تھانے نہیں لے جائیں گے".....

"رئیس سیٹھ!" ــ بی۔ کے۔ داس نے کہا ــ "یہ لوگ اصل بات کرتے شرماتے ہیں۔ ان کے ساتھ سودا کر لو۔ کیوں حوالدار! تم وعدہ کرو نہ یادہ لالچ نہیں کرو گے اور اسے پاکستان کے راستے پر ڈال دو گے۔ یہ پاکستان کا جاسوس نہیں ہے لاؤ رئیس سیٹھ! میں بات پکی کرتا ہوں".....

"میں سارا چکر سمجھ گیا۔ ہندو وردی میں ہو یا دھوتی میں، رقم اور سونا اس کے دل سے دشمنی اور دوستی نکال دیتا ہے۔ مشرقی پاکستان کے متعلق ہر ہندو شہری اور ہندو فوجی کے ارادے یہی تھے کہ لوٹیں گے۔ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہو گا کہ ہندوؤں نے ذاتی طور پر اور ان کی حکومت نے سرکاری طور پر مشرقی پاکستان کو کس بے دردی سے لوٹا ہے۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد مشرقی پاکستان مکتی باہنی اور ہندوؤں کی لوٹ مار کا مرکز بن گیا تھا۔ یہ مال کلکتہ کے بازاروں تک پہنچا تھا۔ کلکتہ میں جو ہندو فوجی تھے، انہیں افسوس تھا کہ انہیں مشرقی پاکستان میں جانے کا موقع نہیں ملا۔ یہ مجھے پاکستان میں آکر پتہ چلا کہ میری طرح بہت سے بہاری اور پنجابی وغیرہ مشرقی پاکستان سے بھاگ کر مغربی بنگال میں پھنس گئے تھے۔ وہاں کے لوگوں نے جن میں فوجی بھی شامل تھے خوب دولت بٹوری تھی اور انہیں نیپال پہنچا دیا تھا۔ اب مجھے بھی اسی چکر میں پھانسا جا رہا تھا۔ انڈین ملٹری پولیس کے اس ہندو حوالدار کے دل میں رقم اور سونے کا لالچ پیدا ہو گیا مگر میرے سامنے میرے وہ میزبان تھے جنہوں نے مجھے اپنے ہاں پناہ دی اور پندرہ روز گھر میں چھپائے رکھا تھا۔ ان کے ساتھ ہی میرے سامنے مغل سرائے والا وہ میزبان آ گیا جسے میں نے ابھی دیکھا بھی نہیں تھا۔۔۔۔

"اگر اٹیچی کیس میں خط نہ ہوتا تو میں انہیں کھول کر دکھا دیتا اور ایک ہزار روپیہ انہیں دے کر ان کی مدد حاصل کر لیتا لیکن خط اور ریوالور نے مجھے قربانی دینے پر تیار کر دیا۔ میں نے بی کے داس کو ایک بار پھر ڈانٹ کر کہا — "میں تمہیں کہہ چکا ہوں کہ تم مجھے کسی شک میں پریشان کر رہے ہو یا مجھے مسلمان سمجھ کر لوٹنا چاہتے ہو۔ میرے پاس تھوڑی سی رقم ہے سونا نہیں ہے" پھر میں نے حوالدار سے کہا — "دیکھو حوالدار! تم وردی میں ہو اور ایک نوسرباز سے مل کر جرم کر رہے ہو۔ میں تمہیں خبردار کرتا ہوں۔ باز آ جاؤ۔ میری گاڑی جا رہی ہے۔ اگر تم نے مجھے روکے رکھا تو میں تمہاری رپورٹ کروں گا"۔۔۔۔

"مگر ہندوستان میں مسلمان کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ ان کافروں کے ساتھ بہت دیر بحث ہوتی رہی۔ پھر گرما گرمی شروع ہو گئی۔ آخر حوالدار نے کہا — "چلو ہمارے ساتھ" — میں مزاحمت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ان کے ساتھ چل پڑا، اور دماغ پر پورا زور دے کر سوچنے لگا کہ ان کی حراست سے کس طرح فرار ہوا جائے۔ ایک ترکیب یہ دماغ میں آئی کہ پلیٹ فارم کے رش میں کہیں غائب ہو جاؤں مگر یہ ممکن نظر نہ آیا۔ رات کا وقت تھا۔ مجھے صرف اندھیرا کسی موزوں جگہ مدد دے سکتا تھا مگر کہاں؟ کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ مجھے پلیٹ فارم سے باہر لے گئے۔ باہر چھوٹی فوجی گاڑی کھڑی تھی جو جیپ کی طرح تھی لیکن پیچھے اس کا ٹیل بورڈ تھا۔ پہلوؤں پر آمنے سامنے دو سیٹیں تھیں۔ گاڑی پر ترپال پڑا ہوا تھا۔ ترپال پیچھے نہیں تھا۔ لانس نائک سٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر انہوں نے بی کے داس کو بٹھا دیا۔ ٹیل بورڈ نیچے کر کے حوالدار نے مجھے پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا اور خود میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے اٹھ کر ٹیل بورڈ اوپر اٹھایا اور اسے پوری طرح چڑھا دیا۔ اٹیچی کیس میرے ہاتھ میں تھا۔۔۔۔

"گاڑی چل پڑی۔ اس کے ساتھ میری سوچنے کی مشینری بھی تیزی سے چلنے لگی مگر نظر یہی آ رہا تھا کہ میرا سفر ختم ہو گیا ہے اور اب میری باقی عمر کا معلوم نہیں کتنا حصہ ہندوستانی جیل خانوں میں گزرے گا۔ مجھے عائشہ اور اپنے بچے ایسے یاد آئے کہ دل ڈوب گیا۔ میں نے اپنے آپ کو یہ یقین دلا کر خوش ہونے کی کوشش کی کہ میرا سارا کنبہ مشرقی پاکستان میں شہید کر دیا گیا ہے اور میں بہت جلدی ان سے جا ملوں گا۔ موت کے خیال سے مجھے خودکشی کا خیال آ گیا۔ میں نے نجات کا یہ طریقہ سوچا کہ اٹیچی کیس سے ریوالور نکال لوں۔ حوالدار کو، بی کے داس اور لانس نائک کو گولی مار دوں اور پھر ایک گولی اپنے سر میں مار لوں۔۔۔۔ ایک اور سکیم ذہن

میں آگئی۔ وہ یہ تھی کہ اٹیچی کیس اس بہانے سے کھولوں کہ حوالدار کو دکھاؤں گا پھر تیزی
سے ریوالور نکال کر تینوں کو باری باری ختم کر دوں اور نکل بھاگوں۔ ریوالور کے
سلنڈر میں چھ گولیاں تھیں۔ حوالدار کے پاس بھی ریوالور تھا اور لانس نائک
کے پاس بھی۔ ان کے ریوالور ان کی بیلٹوں کے ساتھ بندھے تھے۔ مجھے امید
تھی کہ انہیں میں ریوالور نکالنے اور سیدھے کرنے کی مہلت ہی نہیں دوں گا
مگر گاڑی بڑی چوڑی اور پُرہجوم سڑک پر جا رہی تھی۔ بھاگ نکلنا آسان
نہیں تھا.....

"بہر حال اب میرے سامنے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ میں نے اپنے
کنبے کی یاد کو دل سے الگ کر دیا۔ ذہن میں شکست کا جو احساس پیدا ہو گیا تھا، وہ
بھی نکال دیا۔ حوالدار نے کہا ___ 'تم خواہ مخواہ اپنے آپ کو مصیبت میں
ڈال رہے ہو۔ ہیڈ کوارٹر میں جاتے ہی تم سے یہ اٹیچی لے لیں گے اور تمہیں کوارٹر
گارد میں بند کر دیں گے۔ میں تم سے ساری رقم اور زیورات نہیں لوں گا۔ بالکل
واجبی حصہ لوں گا۔ پھر مجھے بتانا کہ تم کہاں جانا چاہتے ہو۔ میں تمہیں پہنچا دوں گا'....

"میری زبان پر آ گئی تھی کہ ایک ہزار روپیہ نقد لے لو اور مجھے گاڑی میں
بیٹھنے دو لیکن مجھے اپنے میزبانوں کے خط کا خیال آگیا اور یہ بھی کہ میں انہیں
بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں مشرقی پاکستان سے آیا ہوں۔ میں نے زبان کو جکڑ لیا
لیکن فرار کا کوئی اور راستہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اسے جواب دیا ___
'بیوقوف نہ بنو میرے دوست' ___ اس سے زیادہ میں کچھ نہ کہہ سکا۔ گاڑی
موڑ کاٹتی چلی جا رہی تھی مجھے شک ہونے لگا کہ یہ لوگ مجھے ملٹری پولیس کے
ہیڈ کوارٹر نہیں لے جا رہے۔ یہ شاید کسی ویرانے کی طرف لے جا کر مجھے
لوٹ لیں گے۔ میں نے سوچ لیا کہ اگر انہوں نے ایسا ہی کیا تو میں فرار ہو سکوں گا
اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے ان کے ساتھ ریوالوروں کی لڑائی لڑنی پڑے.....
میں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس صورت حال کے لیے تیار کر لیا اور میں نے

موت کو بھی قبول کر لیا.....

"انسان کا ذہن خوف اور شکست کو قبول نہ کرے تو خطرے میں ذہن ایسی
ایسی ترکیبیں سوچ لیتا ہے جو نارمل حالات میں ذہن میں آتی ہی نہیں۔ نیت اور ارادہ نیک
ہو تو خدائی مدد ہر وقت شاملِ حال ہوتی ہے۔ گاڑی کے اندر اندھیرا تھا۔
باہر کی روشنیوں سے اندر تھوڑا تھوڑا نظر آتا تھا۔ گاڑی شہر کے اندر ہی
تھی۔ کلکتہ کراچی سے بڑا شہر ہے۔ گاڑی ایک ایسی سڑک پر مڑ گئی جو تنگ تھی
اور اس پر ٹریفک زیادہ نہیں تھی۔ دونوں طرف دکانیں تھیں جن میں بیشتر
بند ہو چکی تھیں۔ لوگ بھی زیادہ نہیں تھے۔ حوالدار نے اپنی جیب سے سگریٹ
پیکٹ نکالا۔ یقین کیجئے کہ میرے دماغ میں بجلی کی طرح چمک پیدا ہوئی
اور مجھے اُردو کی ایک پرانی فلم 'قسمت' یاد آ گئی۔ اس میں اشوک کمار ہیرو تھا۔
میں نے یہ فلم جنگِ عظیم کے دوران کلکتہ میں ہی دیکھی تھی۔ میں برما فرنٹ سے
واپس آیا تو اپنی یونٹ کے ساتھ دو تین مہینے کلکتے میں رکا تھا، اس میں اشوک کمار
کو عادی جیب تراش دکھایا گیا تھا۔ ایک سین یوں تھا کہ وہ گرفتار ہو جاتا ہے
اور ہتھکڑیاں لگا کر اسے ایک پولیس انسپکٹر گاڑی میں بٹھا لیتا ہے۔ راستے میں
انسپکٹر سگریٹ نکال کر منہ میں لے لیتا ہے۔ اشوک کمار اس کے ہاتھ سے ماچس
لے کر اُس کا سگریٹ سلگانے لگتا ہے لیکن جلتی ہوئی دیا سلائی اس کی ناک سے
لگا دیتا ہے۔ انسپکٹر بلبلا اٹھتا ہے۔ اشوک کمار گاڑی سے کود جاتا ہے اور
ہتھکڑی سمیت غائب ہو جاتا ہے.....

"حوالدار کے ہاتھ میں سگریٹ پیکٹ دیکھ کر مجھے اس فلم کا یہ سین
یاد آ گیا اور اس کے ساتھ ہی دماغ اس طرح روشن ہو گیا جیسے خدا نے
میری ذات میں کوئی غیبی قوت پیدا کر دی ہو۔ میں نے اپنے میزبانوں
کا دیا ہوا قیمتی کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ یہ کمبل میں نے آگے سے ہٹا دیا۔ حوالدار
نے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر منہ میں لیا اور مجھ سے پوچھا ___ 'سگریٹ پیئو گے'

گئے ؛ میں نے اُس کے ہاتھ سے پیکیٹ بھی لے لیا اور ماچس بھی۔ ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں لے لیا۔ خدا کی مدد ملاحظہ فرمایئے کہ آگے موڑ تھا گاڑی کی رفتار کم ہو گئی۔ میں نے جو سوچا تھا وہ موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ مجھے اب ایک خوفناک خطرہ مول لینا ہی تھا۔ اب تو میں خودکشی پہ بھی غور کر چکا تھا۔ میں نے ماچس کھولی ایک دیا سلائی نکالی اور ماچس بند نہ کی۔ دیا سلائی جلا کر حوالدار کے سگریٹ تک لے گیا۔ ماچس کی ڈبیا دوسرے ہاتھ میں تھی میں نے اُس کا سگریٹ سلگا کر جلتی ہوئی دیاسلائی کھُلی ہوئی ماچس کی دیا سلائیوں کے ساتھ لگا دی۔ یکلخت ساری دیا سلائیاں جل اٹھیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ماچس اس کے منہ کے ساتھ لگا دی۔ شعلہ اس کی آنکھوں تک گیا۔ حوالدار ہڑبڑا کر پیچھے ہٹا۔ میں نے بجلی کی تیزی سے اپنا کمبل اتارا اور اُس کے اوپر کمبل پھینک کر اٹیچی کیس اٹھایا اور گاڑی کے ٹیل بورڈ سے کود کر سڑک پر آ گیا۔ ماچس جلانے، کمبل پھینکنے اور کودنے میں بمشکل دو سکینڈ صرف ہوئے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے اُس کی آنکھیں جل گئی ہوں۔۔۔۔

" گاڑی موڑ تک پہنچ گئی۔ میں پیچھے کو بھاگا۔ دس پندرہ قدم دور دائیں طرف ایک گلی نظر آئی۔ میں اس میں چلا گیا۔ گلی اندھیری اور سنسان تھی۔ میں بہت تیز دوڑا اور گلی جدھر مڑتی گئی، میں مڑتا گیا۔ مجھے اپنے پیچھے کوئی آواز نہیں سنائی دی۔ مجھے توقع یہ تھی کہ پیچھے سے اکٹھے دو ریوالور فائر ہوں گے اور میرا سفر ختم ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ گاڑی رکتے رکتے آگے نکل گئی تھی اور حوالدار کو سنبھلتے سنبھلتے کچھ وقت لگ گیا ہو گا۔ اس ذرا سے وقت میں کلکتے کی اندھیری گلیوں نے مجھے پناہ میں لے لیا۔ میں چلنے لگا تا کہ کوئی شک نہ کرے۔ میں ریلوے سٹیشن تک جانے کی تو سوچ ہی نہ سکتا تھا۔ میں نے اپنے طور پر سوچا کہ حوالدار میرے تعاقب میں ریلوے سٹیشن کی طرف جائے گا۔ صرف دس منٹ گزرے تھے کہ وہ مجھے ریلوے سٹیشن سے لایا تھا۔ ریل

گاڑی کی روانگی میں ابھی چند منٹ باقی تھے۔ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ میں نے ٹکٹ خرید لیا تھا۔ میں گلیوں کے موڑ مُڑتا گیا اور ایک گلی مجھے سڑک پر لے گئی۔ مجھے اسی سڑک سے گزارا گیا تھا۔۔۔۔

" میں گلی کے سرے پہ جا کر رک گیا۔ یہ مصروف سڑک تھی۔ روشنی بھی زیادہ تھی۔ میں اندھیرے میں رک کر سڑک پہ بھاگتی دوڑتی ٹریفک کو دیکھنے لگا۔ مجھے ملٹری پولیس کی وہ گاڑی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ ٹیکسیاں بھی تھیں مگر میں آگے جا کر کسی ٹیکسی کو روکنے سے گھبراتا تھا۔ وہاں مجھے کم و بیش دس منٹ رکنا پڑا۔ یہ دس منٹ بہت ہی طویل تھے۔ میں دشمن کے شہر میں بھٹک رہا تھا جہاں کی ہر چیز میری دشمن تھی، میرے لئے کوئی پناہ نہیں تھی۔ میں نے سوچا یہ تھا کہ ٹیکسی میں سوار ہو کر کلکتہ سے اگلے سٹیشن تک جاؤں گا مگر وقت گزرتا جا رہا تھا۔ میری یہ سکیم صرف اس صورت میں کامیاب ہو سکتی تھی کہ میں اگلے سٹیشن پر گاڑی سے پہلے پہنچ جاتا۔ مشکل یہ تھی کہ میں آگے ہو کر ٹیکسی روکنے سے ڈر رہا تھا۔ آخر مجھے یہ خطرہ بھی مول لینا پڑا۔ میں آگے چلا گیا اور سڑک کے دونوں طرف آنکھیں سکیڑ کر دیکھنے لگا کہ ملٹری پولیس کی گاڑی تو نہیں آ رہی۔۔۔۔

" ایک ٹیکسی میرے اشارے پر رک گئی میں نے ڈرائیور سے کہا کہ میں نے مغل سرائے کے لئے ٹکٹ خرید کر سامان گاڑی میں رکھوا دیا اور خود ایک کام سے باہر نکل آیا۔ گاڑی وقت سے دو چار منٹ پہلے ہی چل پڑی اور میں رہ گیا۔ میرا سامان چلا گیا ہے۔ مجھے اگلے سٹیشن تک پہنچا دو، جو مانگو گے دوں گا۔ ڈرائیور نے پوچھا ــــ آپ کو ریلوے سٹیشن سے ٹیکسی نہیں ملی تھی ؟ یہاں تک آپ کیوں آ گئے ہیں ؟ میں اتنی دور نہیں جاؤں گا ــــ اور وہ چلا گیا لیکن میری ایک غلطی درست کر گیا۔ مجھے یہ کہانی ریلوے سٹیشن پر جا کر کسی ٹیکسی ڈرائیور کو سنانی چاہیئے تھی۔۔۔۔

"میں نے دماغ پر زور دیا اور ایک نئی بات دماغ میں آ گئی۔ ایک اور ٹیکسی روکی۔ یہ ایک دبلا پتلا بنگالی ڈرائیور تھا۔ میں نے اسے بنگالی زبان میں یہی کہانی سنائی اور اضافہ یہ کیا کہ ریلوے سٹیشن سے ایک ٹیکسی لے لی تھی مگر وہ یہاں آ کر ایسی بگڑی کہ ٹھیک نہ ہو سکی۔ مجھے مجبوراً چھوڑنی پڑی۔ ابھی ابھی اسے دوسری ٹیکسی گھسیٹ کر لے گئی ہے۔ میں نے اس ڈرائیور کی منّت کی اور کہا کہ جو مانگو گے دوں گا۔ سامان میں میرا پچیس ہزار روپے کا زیور چلا گیا ہے..... اس نے کہا۔ "میں کوئی فالتو پیسہ نہیں لوں گا۔ ڈبل کرایہ لوں گا کیونکہ اُدھر سے مجھے خالی آنا پڑے گا۔" اُس نے اگلے سٹیشن کا صحیح فاصلہ نہیں بتایا۔ کہتا تھا کہ دس بارہ میل سے زیادہ ہے۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی چل پڑی اور پھر اللہ نے مجھ پر یہ کرم کیا کہ ٹیکسی اس اتنے وسیع اور گنجان شہر سے نکل گئی جہاں ملٹری پولیس مجھے ڈھونڈ رہی تھی۔ میں بار بار پیچھے دیکھتا تھا۔ کوئی بھی گاڑی پیچھے سے آتی تھی میں سر نیچے کر لیتا تھا۔ ڈرائیور ہندو تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں ہندو ہوں یا مسلمان۔ میں نے جواب دیا کہ ہندو ہوں۔ اس نے مشرقی پاکستان کی فتح کی باتیں شروع کر دیں.....

"میں نے اسے خوش کرنے کے لئے اس سے بڑھ چڑھ کر فتح کی باتیں شروع کر دیں۔ اُس نے ایک ایسی بات بتائی جس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ اُس نے کہا کہ مشرقی پاکستان کی سینکڑوں غیر بنگالی مسلمان لڑکیاں جو مکتی باہنی نے وہاں سے اغوا کی تھیں، کلکتے میں لا کر بردہ فروشوں اور عصمت فروشوں کے ہاتھ بیچ ڈالی ہیں۔ ڈرائیور چونکہ ہندو تھا اور ڈرائیور بھی تھا، اس لئے وہ خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔ اس نے نہایت غلیظ زبان میں ان پنجابی اور بہاری لڑکیوں کا ذکر کیا جو اغوا ہو کر کلکتے میں فروخت ہوئی تھیں۔ میرے خون میں جو ابال اٹھا وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

ایک بار تو میں اتنا بے قابو ہو گیا کہ اس ہندو ڈرائیور کو گولی مارنے لگا تھا لیکن عقل نے مجھے ٹھنڈا کر دیا۔ میں بے بس تھا۔ قوم کی ان بیٹیوں کے لئے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میرے آنسو نکل آئے اور مجھے اپنی بچی یاد آ گئی جس کی عمر پندرہ سال تھی۔ میں اُسے ڈھاکہ میں چھوڑ آیا تھا۔ بار بار یہ تصور میری آنکھوں کے آگے آ جاتا کہ میری بیٹی کلکتے کے بازار میں فروخت ہو رہی ہے۔ میں اس تصور کو نظروں سے ہٹاتا تو پھر سامنے آ جاتا۔ میرا سارا جسم کانپنے لگا.....

"ڈرائیور نے یہ کہ کر مجھے اس اذیت سے ذرا سی نجات دلا دی۔ "وہ آپ کی گاڑی جا رہی ہے۔" میں نے دیکھا۔ تھوڑی ہی دور ریل گاڑی کی بتیاں نظر آئیں۔ گاڑی بہت تیز تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔ "اور تیز چلو۔ گاڑی سے پہلے پہنچا دو۔" اس نے رفتار تیز کر دی۔ اس کی گاڑی اچھی تھی۔ سڑک خالی تھی۔ اس کی رفتار ساٹھ تک پہنچ گئی۔ ریل گاڑی کی رفتار اس سے کم تھی.... بہر حال میں ریل گاڑی اور ٹیکسی کی دوڑ میں الجھ گیا۔ گاڑی غائب ہو گئی۔ دور سامنے مجھے بتیاں نظر آنے لگیں۔ یہ اگلا سٹیشن تھا۔ ریل گاڑی کی بتیاں ایک بار پھر نظر آنے لگیں، لیکن گاڑی ہم سے آگے نکل گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ریلوے لائن سیدھی تھی اور سڑک کے موڑ زیادہ تھے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے یہ دیکھا کہ گاڑی سٹیشن پر رُکی نہیں۔ اسی رفتار پر گزر گئی۔ میرے ڈرائیور نے ٹیکسی روک لی اور مجھ سے پوچھا۔ "یہ گاڑی کتنے بجے چلی تھی؟" میں نے صحیح وقت بتایا تو اس نے کہا۔ "میں اس سے آگے نہیں جاؤں گا۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ یہ پسنجر ٹرین نہیں۔" اس نے کہا۔ "یہ ایکسپریس ہے۔ یہ یہاں سے پچاس میل دور پانچویں یا چھٹے سٹیشن پر رکے گی۔ میں اتنی دور نہیں جاؤں گا۔"

"میں نے اُسے کہا کہ وہ مجھے پانچ سو میل دور لے جائے گا، تو بھی میٹر کے حساب سے دگنا کرایہ دوں گا۔ مجھے ہر قیمت پر گاڑی پکڑنی ہے، مگر اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ آج کل رہزنی کی وارداتیں زیادہ ہوتی ہیں، اس لئے وہ اتنی دور نہیں جائے گا۔ میں نے اس کی منت سماجت بھی کی مگر وہ چلنے پر آمادہ نہ ہُوا۔ میں نے اٹیچی کیس کھول کر ریوالور نکالا۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ جیب سے سو سو کے نوٹ نکالے اور ڈرائیور سے کہا —— "اندر کی بتی جلاؤ"۔ اُس نے اندر کی بتی جلا دی۔ میں نے ایک ہاتھ میں ریوالور اس کے سامنے کر دیا اور دوسرے ہاتھ میں نوٹ آگے کئے اور اسے کہا —— "تمہیں کیا چاہیئے؟ ریوالور کی گولی یا رقم؟" —— اُس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا —— "میں تمہیں گولی مار کر لاش جنگل میں پھینک دوں گا اور ٹیکسی لے جاؤں گا مجھے گاڑی تک پہنچا دو گے تو جتنے پیسے مانگو گے دوں گا"......

"اُس نے آہ بھری اور ٹیکسی چلا دی۔ میرے کہنے پر اس نے اندر کی بتی بجھا دی۔ میں نے ریوالور والا ہاتھ اُس کی سیٹ پر ہی رکھا اور اسے کہا —— "ساٹھ پر چلاؤ"۔ اس نے کہا —— "یہ ہاتھ ہٹالو" —— میں نے ہاتھ پیچھے کر لیا اور اس کی رفتار کی سوئی ساٹھ سے بھی تھوڑا آگے نکل گئی۔ وہ اس قدر خوفزدہ ہو گیا کہ اس نے فروخت ہونے والی مسلمان لڑکیوں کی بات پھر نہ کی۔ مجھے یہ ڈر محسوس ہونے لگا کہ وہ راستے میں کسی قصبے میں پولیس سٹیشن میں ہی نہ لے جائے۔ میں چوکنا رہا۔ اُس نے صرف ایک بار پوچھا —— 'پیسے تو نہیں مار لو گے، میں غریب آدمی ہوں' —— میں نے اسے جواب دیا کہ بولو، کتنے لو گے؟ ابھی لے لو۔ لیکن اسے اطمینان ہو گیا۔ میں نے پوچھا —— 'پٹرول کافی ہے؟' —— اس نے کہا —— 'اگلے پمپ سے ڈلوا لوں گا'......

"راستے میں اس نے ایک پمپ سے تین گیلن پٹرول ڈلوایا اور پھر اُسی رفتار پر چل پڑا۔ ایک جگہ ریل گاڑی کی بتیاں نظر آئیں۔ ٹیکسی آگے نکل گئی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ گاڑی کو پکڑ لوں گا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ جب ٹیکسی نے مجھے اُس

سٹیشن پر پہنچا دیا جہاں گاڑی کو رکنا تھا۔ میٹر چالیس روپے بیس پیسے دکھا رہا تھا۔ اس کا دگنا اسی روپے چالیس پیسے تھا۔ میں نے سو روپے کا نوٹ نکالا اور ڈرائیور کو دے کر اُس کا شکریہ ادا کیا اور اسے رخصت کیا۔ ریل گاڑی پندرہ منٹ بعد آئی۔ سردی پریشان کرنے لگی۔ میں کمبل ملٹری پولیس کے حوالدار کے اوپر پھینک آیا تھا۔ میرے گرم کپڑے اٹیچی کیس میں تھے جو میں ابھی بدل نہیں سکتا تھا۔ میں تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں گھس گیا۔ بمشکل کھڑا رہنے کی جگہ تھی۔ فائدہ یہ ہُوا کہ بھیڑ کی وجہ سے ڈبہ گرم تھا۔ میں دشمن مخلوق میں پھنس کے کھڑا رہا۔ کرۂ ارض پر اس سے زیادہ قابلِ نفرت مخلوق اور کہیں نہیں ملے گی۔ یہ میری مجبوری تھی کہ میں ایسے ذلیل، مکار اور کمینے لوگوں میں کھڑا رہا۔ یہ میرے دشمن تھے۔ میرے ملک اور میرے مذہب کے دشمن تھے۔ ان لوگوں نے ۱۹۴۷ء میں میری قوم کی بیٹیوں کو بے آبرو کیا تھا۔ ۱۹۶۵ء میں مغربی پاکستان کے سرحدی دیہات میں اسی درندگی کو دہرایا تھا اور اب مشرقی پاکستان کی عصمت دری کی تھی۔ آج جب میں محترم علی اظہر کو یہ کہانی سنا رہا ہوں تو بھی ان ہندوؤں کی بدبو میرے اندر بھری ہوئی ہے جن کے ساتھ میں نے مغل سرائے تک سفر کیا تھا۔ کاش، میرے وہ پاکستانی بھائی بھی یہ متعفن بُو سونگھ سکیں جو ہندو کی دوستی کی باتیں کرتے ہیں......

"دوسرے دن مغل سرائے پہنچا۔ اپنے میزبان کی تلاش میں مجھے زیادہ پریشان نہ ہونا پڑا۔ وہ میری عمر کے صاحب تھے۔ انہیں خط دیا تو وہ کوئی بات کئے بغیر اٹھے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ ان کا مکان دور نہیں تھا۔ مجھے ایک کمرے میں بٹھایا اور کہا —— "اب بتائیے آپ یہاں تک کس طرح پہنچے۔ دل میں اگر کوئی ڈر ہے تو وہ نکال دیجئے۔ آپ اپنے گھر میں ہیں"۔

"میں نے انہیں بتا دیا کہ مشرقی پاکستان سے کس طرح نکلا ہوں......

"ان حضرات کے نام تحریر میں لائے بغیر میں اپنی کہانی کو مکمل نہیں سمجھتا جنہوں نے مجھے ہندوستان سے نکلنے میں مدد دی ہے۔ مگر میں ان کے نام تحریر میں نہیں لا سکتا، کیونکہ ہندو حکمرانوں کی نگاہ میں ہندوستانی مسلمان کا پاکستانی مسلمان کو مدد دینا ایسا جرم ہے جس کا ہندوستانی قانون میں کہیں ذکر نہیں آتا مگر اس کی سزا بڑی بھیانک ہے۔ میں اپنے ان محسنوں کو ہندوستانیوں کے کاغذات پر بلیک لسٹ نہیں کرانا چاہتا۔ کاش میں کبھی ان کے لئے کچھ کر سکوں۔ آج جب مجھے یہ محسن یاد آتے ہیں تو میں اپنی بپتا بھول جاتا ہوں۔ بپتا تو اُن کی ہے سننے والی اور پاکستانیوں کو سنانے والی۔ کلکتے میں، مغل سرائے اور آگے چل کر امرتسر میں مجھے جو مسلمان ملے انہوں نے مشرقی پاکستان پر لہو کے آنسو رو کر یہ ضرور کہا کہ ہم امید لگائے بیٹھے تھے کہ پاکستانی جنگجو قوم ہے۔ ہندوستان کا کچھ علاقہ لے لے گی مگر پاکستانی اپنا آدھا ملک دے بیٹھے......

"ٹریجیڈی یہ ہوئی ہے کہ ہندوستان میں ہندو کا سر اونچا اور ہندوستانی مسلمان کا سر نیچا ہو گیا ہے۔ مغل سرائے کے اس مسلمان بزرگ نے مجھے گھر میں چھپا لیا۔ میں نے انہیں مشرقی پاکستان کے حادثے کی تفصیل سنائی۔ پھر ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ انہوں نے کہا: "ہم اب بھی پاکستان کی طرف دیکھ رہے ہیں..... ستمبر ۱۹۶۵ء میں سرحد سے اتنی دور مغل سرائے میں ہندوؤں کا یہ حال ہو گیا تھا کہ وہ مسلمان کو جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ ہم نے سنا تھا کہ امرتسر اور جالندھر خالی ہو گئے ہیں۔ دلی سے ہندو بھاگ کر اس طرف آ گئے تھے اور یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ دلی سے فوجی ہیڈ کوارٹر اور مرکزی حکومت کے دفتر بھی وہاں سے منتقل ہونے شروع ہو گئے تھے۔ اِدھر کلکتے کے قریب تین ہوائی اڈوں پر پاکستانی

ہوا بازوں نے حملے کر کے تباہی مچائی تو کلکتے شہر اور ارد گرد کے علاقوں کے بیشمار ہندو مغل سرائے تک بھاگ آئے تھے۔ غیر مسلموں پر اتنی دہشت طاری ہو گئی تھی کہ وہ چھ ستمبر کے روز پاکستان کی جو پھبتیاں اڑاتے تھے، ان پر وہ نادم تھے۔ بعض نے اپنی حکومت کو گالیاں دینی شروع کر دی تھیں۔ پاکستان بننے کے بعد یعنی ہندوستان کے غلام ہونے کے بعد ہم نے پہلی بار سکون کا سانس لیا اور سر اونچا کیا تھا۔ ہم غلامی میں آزاد ہو گئے تھے اور ہم نے اپنا بھولا بسرا وقار حاصل کر لیا تھا، لیکن سترہ دنوں بعد ہمارے سر پھر نیچے ہو گئے......

"اعلان تاشقند تک ہمارا وقار قائم رہا۔ اس بزدلانہ معاہدے کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کا جینا حرام ہو گیا۔ پولیس ہر ایک مسلمان کو پاکستان کا جاسوس سمجھنے لگی۔ جسے بھی اور جب بھی چاہا تھانے بلا لیا۔ بے عزتی کی اور بلاوجہ پولیس سٹیشنوں میں بھوکا پیاسا کئی کئی دن بٹھائے رکھا۔ ہندو شہریوں نے ہمیں طعنوں کا نشانہ بنا لیا۔ جن جوشیلے مسلمانوں نے جنگ کے دوران جوش میں آ کر ہندوستان پر پاکستانی غلبے کی باتیں کی تھیں، اُن کا سرکاری طور پر اور غیر سرکاری طور پر بُرا حشر کیا گیا۔ ہم میں سے بہت سے مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقامی لیڈروں اور پولیس کے افسروں کے آگے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنی پڑی۔ انہوں نے وعدے کئے کہ وہ آئندہ پاکستان کے حق میں کوئی بات نہیں کریں گے۔ ہم نے اپنی قسمت پاکستان کے ساتھ وابستہ کر رکھی ہے۔ پاکستان سر جھکاتا ہے تو یہاں ہندوستان میں ہمارے بھی سر جھک جاتے ہیں۔ پاکستان جب کبھی ہندوستان کی دُم پر پاؤں رکھتا ہے تو ہم پاؤں ہندوستان کی گردن پر رکھ دیتے ہیں مگر پاکستان کی پالیسی اتنی کمزور ہے کہ ہندوستان کے آگے جھکتے ذرا دیر نہیں لگاتا۔ اس سے پاکستان کے حکمرانوں کا تو شاید کچھ نہیں بگڑتا ہوگا سزا ہمیں بھگتنی پڑتی ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اپنے آپ کو ہندوستانی کہلاتے ہیں مگر ہندو انہیں پاکستانی سمجھتے ہیں۔ ہندو دراصل یہ چاہتے ہیں ہم یہاں مسجدیں گرا دیں۔ قرآن پڑھنا چھوڑ دیں، اپنے مذہب کا نام نہ لیں اور اپنے آپ

کو مسلمان ہی کہلاتے رہیں تاکہ ہندو حکمران دنیا کو یہ بتائیں کہ دیکھو یہاں مسلمان بھی آباد ہیں اور وہ کتنے خوش ہیں"......

مغل سرائے کے بزرگ ہندوستان کی غلامی سے آزاد ہونے کو بے تاب تھے۔ وہاں کے تمام مسلمانوں کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"تین دسمبر ۱۹۷۱ء کی رات ہندوستان پر ایک بار پھر پاکستان کی دہشت طاری ہو گئی۔ ہم نے جب یہ خبر سنی کہ پاکستانی طیاروں نے آگرہ کے ہوائی اڈے تک آکر بمباری کی ہے تو ایک بار پھر ہمارے سینے رُکے ہوئے نعروں سے پھٹنے لگے۔ رات کو اندرا گاندھی نے جب آل انڈیا ریڈیو سے تقریر کی تو اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔ صبح ہوئی تو ہندو ہمیں سلام کر رہے تھے۔ افواہیں ایسی اڑیں کہ پاکستان کی فوج آدھے مشرقی پنجاب پر قابض ہو چکی ہے۔ دِلّی پر بھی پاکستانیوں نے بمباری کی ہے اور وہاں سے مرکزی حکومت کے دفتر کسی نامعلوم جگہ منتقل ہو گئے ہیں۔ ایسی اور بھی بہت ساری افواہیں اڑیں مگر ہم پاکستانی فوج کا انتظار ہی کرتے رہے اور یہ خبر سنی کہ مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ ہماری رگوں میں خون جم گیا۔ ہندوؤں نے اسلام اور پاکستان کے خلاف انتہائی بیہودہ کلمے کہے۔ میں دکان پر بیٹھا تھا۔ ایک ہندو تاجر نے مجھے کہا — "اب بتاؤ تمہارا محمد بن قاسم اور محمود غزنوی کہاں گئے؟ سالے ڈاکوؤں کو تم مجاہد بنائے پھرتے تھے۔ آج تمہاری ساری تاریخ جھوٹی ہو گئی ہے"۔ ہم نے اس سے زیادہ شرمناک طعنے سنے اور برداشت کئے اور ہم جیتے جی مر گئے۔ ایک بار پھر بڑے بڑے شریف اور معزز مسلمانوں کے خلاف مخبریاں ہو رہی ہیں اور انہیں پولیس سٹیشنوں میں بلا کر ذلیل کیا جا رہا ہے۔ قائداعظم نے پاکستان بنا کر تم لوگوں پر عظیم احسان کیا ہے۔ اگر پاکستان نہ بنتا تو ہندوستان میں مسلمانوں کی یہی حالت ہوتی [illegible]

کہا جاتا ہے۔ اُس صورت میں یہاں مسلمانوں کو عربوں کا جاسوس کہہ کر ذلیل کیا جاتا۔ اس وقت یہ حالت ہو گئی ہے کہ ہماری عورتوں کی عزت محفوظ نہیں۔ شام کے بعد ہم عورتوں کو باہر نہیں نکلنے دیتے۔ ہندو غنڈے کسی مسلمان عورت پر دست درازی کریں تو پولیس شکایت نہیں سنتی۔ اُلٹا اس عورت کو بلا کر مزید ذلیل کرتی ہے"......

"انہوں نے مجھے اپنے پاس پناہ دے کر روحانی سکون محسوس کیا اور اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا — "ہمارے اپنے مکانوں کی دیواریں بھی ہماری جاسوسی کرتی ہیں۔ آپ کو پناہ دینا ایک سنگین جرم ہے لیکن میں یہ جرم کرتے ہوئے اس طرح خوشی محسوس کر رہا ہوں جیسے پاکستان کے لئے بہت بڑا کام کر رہا ہوں۔ میں آپ کو سرحد پار نہیں کرا سکتا، سرحد کے قریب پہنچا دوں گا۔ اگر آپ روپے پیسے سے سرحد پار کر سکتے ہیں تو میں منہ مانگی رقم دے کر آپ کو ہندوستان سے نکال دوں گا"۔ پھر ہم سکیم بناتے رہے۔ میری داڑھی بڑھ آئی تھی۔ انہوں نے میرے لئے ایک شیروانی اور پاجامہ سلوایا۔ آنکھوں پر زیرو کا چشمہ چڑھا دیا۔ اس سے میرا حلیہ بالکل ہی بدل گیا۔ میرے پاس پیسے بہت تھے۔ خطرناک چیز ریوالور تھی۔ یہ میں نے اٹیچی کیس میں چھپا رکھا تھا۔ ان بزرگوں نے چار روز مجھے اپنے پاس رکھا۔ پانچویں روز اپنے ایک عزیز کے ساتھ دِلّی پہنچا دیا۔ مجھے رخصت کرتے وقت میرے اس بزرگ میزبان نے آنسو بھری آنکھوں سے کہا تھا۔ "اللہ آپ کو خیریت سے پاکستان پہنچا دے۔ اپنی حکومت سے کہنا کہ ہم تمہاری فوج کا انتظار کر رہے ہیں"۔ ریل گاڑی کا سفر اس لحاظ سے بے حد اذیت ناک تھا کہ ہندو اور سکھ مسافر مشرقی پاکستان کی فتح کی باتیں کرتے، پاکستان کو رُسوا کرتے اور یہ کہتے تھے کہ مغربی پاکستان کو بھی ہندوستان میں شامل کر لیا جائے گا۔ ہم سنتے رہے۔ ہندوؤں نے ہمارے ساتھ

طنزیہ باتیں کیں جو ہم نے غلاموں کی طرح مسکرا کر برداشت کیں ......

"دلّی میں ایک اور مسلمان گھرانے میں قیام ہُوا۔ وہاں کے میزبانوں نے بھی وہی باتیں کیں اور انہی جذبات کا اظہار کیا جو کلکتے اور مغل سرائے میں میرے محسنوں نے کیا تھا۔ دلّی والوں کا ردِ عمل ذرا زیادہ شدید تھا۔ انہوں نے تصدیق کی کہ تین دسمبر کی رات پاکستان کے ہوائی حملوں سے دلّی میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ بڑے بڑے ہندو اور سکھ تاجر دلّی سے نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ محلوں اور بازاروں میں خوف اتنا زیادہ تھا کہ بعض لوگ بات کرتے تھے تو ان کی زبانیں ہکلاتی تھیں۔ حالانکہ دلّی پر کوئی بم نہیں گرا تھا۔ دلّی کے مسلمانوں کی مسرت کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں ...... میرے ان میزبانوں نے بھی کہا کہ وہ مجھے سرحد پار نہیں پہنچا سکتے، روپے پیسے کی بے دریغ مدد کر سکتے ہیں اور انہوں نے یہ پیشکش بھی کی کہ وہ مجھے ہر خطرے میں پناہ دینے اور میری خاطر جانیں قربان کرنے کو تیار ہیں۔ مجھے یہ مشورہ بھی دیا کہ میرا اچکن اور پاجامے والا حلیہ درست نہیں۔ وہ مجھے امرتسر تک پہنچا رہے تھے کہتے تھے کہ وہاں اچکن اور پاجامہ شک پیدا کرے گا۔ میں نے انہیں اپنی جیکٹ اور پتلون دکھائی تو انہوں نے اطمینان کا اظہار کیا۔ یہ دونوں کپڑے ڈرائی کلینر کے پاس بھیج دیئے۔ بہت میلے ہو چکے تھے۔ مغل سرائے سے جو صاحب میرے ساتھ آئے تھے وہ واپس چلے گئے ......

"یہاں مجھے تین دن رکھا گیا۔ رخصت ہوتے وقت میں نے پتلون اور جیکٹ پہنی۔ یہ لوگ کاروباری تھے۔ ان کا چھوٹا سا کارخانہ بھی تھا۔ میں ان کی مصنوعات نہیں بتا سکتا، کیونکہ ان کی نشاندہی کا خطرہ ہے۔ انہوں نے مجھے ان مصنوعات کے نمونے دیئے۔ اپنی فرم کے پیڈ پر مجھے یہ لکھ دیا کہ حاملِ رقعہ ہذا ہماری فرم کا نمائندہ ہے۔ فرم کے نام پر آرڈر فراہم کر سکتا ہے اور لین دین بھی کر سکتا ہے۔ اس تجارتی خط پر میرا نام امتیاز حسین

لکھا گیا۔ امرتسر میں مجھے دکانداروں کو یہ مصنوعات دکھا کر آرڈر بک کرنے تھے اور اس دوران سوچنا تھا کہ میں سرحد کس طرح پار کروں۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ سرحد پر ہندوستانی فوج مورچہ بند ہے۔ یہی وہ جہنم تھا جس میں سے مجھے زندہ نکل کر جانا تھا۔ ہندوستان میں سے گزرنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا۔ اگر مشکل تھا تو وہ ان مسلمان محسنوں نے آسان کر دیا تھا۔ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ کوئی ایسی جگہ ہے جہاں فوج نہ ہو۔ یہ میرے سفر کا آخری اور انتہائی خطرناک حصہ تھا...... میں مشرقی پنجاب کا ہی رہنے والا تھا جہاں سے میں اپنی پہلی بیوی کو قتل کر کے بھاگا تھا اور امرتسر جا کر فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ میرا فرار وہیں سے شروع ہُوا تھا۔ مجھے کچھ ایسا خطرہ بھی محسوس ہونے لگا کہ میرا فرار امرتسر میں ہی ختم ہو گا اور قدرت مجھ سے بیوی کے قتل کا انتقام لے گی۔ اپنے میزبانوں نے جب مجھے بتایا کہ وہ اپنے ایک آدمی کے ساتھ مجھے امرتسر بھیج رہے ہیں تو مجھے پہلی بیوی یاد آ گئی اور وہ وقت میرے سامنے آ گیا جب میں نے اس بیوی سے تنگ آ کر اسے قتل کیا تھا۔ ایک بار پھر اپنی اس بیوی کے طعنے میرے کانوں میں گونجنے لگے ——— "تم بزدل ہو۔ تم بزدل ہو" ——— میں نے اپنے جسم میں نقاہت سی محسوس کی جیسے میں اس خطرناک سفر سے تنگ آ گیا ہوں اور کوئی مزید خطرہ برداشت نہیں کر سکوں گا۔ بیوی کو قتل کئے اور وہاں سے بھاگے تیس سال گزر گئے تھے مگر وہ ایک ہی روز پہلے کی واردات معلوم ہوتی تھی۔ یہ ڈر بھی دل میں سمانے لگا کہ میری پہلی بیوی کے رشتہ دار ابھی اسی علاقے میں ہوں گے اور مجھے پہچان کر پولیس کے حوالے کر دیں گے ......

"مجھے یہ ڈر بھی محسوس ہونے لگا کہ مقتولہ میرے اعصاب پر پھر سے سوار نہ ہو جائے جس طرح عائشہ کے ساتھ شادی کر کے ہوئی تھی۔ عائشہ یاد آئی

تو مجھے اپنے بیٹے اور بیٹی بھی یاد آ گئی۔ مجھے ان کے متعلق کوئی یقین نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ وہ زندہ ہیں۔ یہ ایک قسم کی خود فریبی تھی جس سے مجھے سکون سا محسوس ہوا اور میرا یہ عزم ایک بار پھر پختہ ہو گیا کہ مجھے ہر طرح کے خطروں کا مقابلہ کر کے عائشہ کے لئے زندہ رہنا ہے۔ یوں تو ہر انسان ہر مشکل اور ہر مصیبت میں امید کا دامن نہیں چھوڑتا لیکن مجھے میری ذات سے اٹھتی ہوئی ایک آواز یقین دلا رہی تھی کہ میں ہندوستانی فوجوں میں سے بھی نکل جاؤں گا اور مجھے اپنا کنبہ بھی مل جائے گا۔ یہ یقین یا یہ امید اپنے آپ ہی پختہ نہیں ہوئی تھی۔ میں خدا سے مسلسل دعا مانگ رہا تھا۔ عائشہ نے مشرقی پاکستان میں اپنے بچوں کو قرآن پڑھایا تھا اور دلی عقیدت مندی سے سب بچوں کو سورہ مزمل اور آیتہ الکرسی زبانی یاد کرائی تھی۔ میں نے بھی اُسی کے کہنے پہ دونوں زبانی یاد کر لی تھیں۔ عائشہ کا عقیدہ تھا کہ سورہ مزمل اور آیتہ الکرسی پڑھو تو سیلاب بھی راستہ دے دیتا ہے۔ میں نے اُس کے عقیدہ میں یہ اضافہ کر کے بچوں کو سبق دیا تھا کہ صرف پڑھنے اور پھونکنے سے کوئی مشکل آسان نہیں ہُوا کرتی۔ عمل اور جدوجہد کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے سفر کے دوران سورۂ مزمل اور آیتہ الکرسی کا ورد جاری رکھا۔ کالکتہ، مغل سرائے اور دلّی میں جب میزبان سو جاتے تھے تو میں آدھی رات کے بعد نفل پڑھتا اور خدا سے مدد کی التجا کرتا تھا۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ جدوجہد کے ساتھ دعا کامیابی کی ضامن ہوتی ہے اور دعا جدوجہد کے بغیر کوئی اثر نہیں رکھتی۔۔۔۔

" میرے دلّی والے میزبانوں نے اپنا ایک آدمی میرے ساتھ کر دیا اور ہم امرتسر پہنچ گئے۔ اس سفر میں کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ غیر مسلم مسافر فتح پر مسرور تھے اور ان کے دلوں سے پاکستان کا ڈر نکل گیا تھا۔ ان کی نظروں میں اب مسلمان جنگجو نہیں رہے تھے۔ اس سفر میں بھی مجھے پاکستان کے خلاف بڑی

ہی ناگوار باتیں سننی پڑیں۔ صرف ایک مسلمان مسافر نے ایک بار کہا کہ فتح اور شکست عارضی چیزیں ہیں۔ آج پاکستان ہار گیا ہے تو کل ہندوستان ہار جائے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہندو اُس پہ ٹوٹ پڑے۔ اگر وہ دبک نہ جاتا تو ہندو اُسے گاڑی سے باہر پھینک دیتے۔ وہ چپ ہو گیا اور ہندو اور سکھ مسافر اس مسلمان مسافر کا سٹیشن آنے تک اُسے، پاکستان کو اور ہندوستان کے مسلمان فاتحین کو گالیاں دیتے رہے۔ میں نے دو تین بار اپنے اوپر بڑی مشکل سے قابو پایا ورنہ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ ریوالور نکال کر جتنی گولیاں پاس ہیں وہ ان کافروں پر فائر کر دوں۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کے لئے مجھے اتنا ہی زور لگانا پڑا جتنا منہ زور گھوڑے پر لگایا جاتا ہے۔۔۔۔۔

" خدا خدا کر کے امرتسر آیا۔ میں نے جب یہ شہر دیکھا تو یقین نہ آیا کہ یہ امرتسر ہے۔ میرے ذہن میں تیس سال پہلے والا امرتسر تھا۔ وہ امرتسر ۱۹۷۲ء والے امرتسر کے سامنے گاؤں لگتا تھا۔ دلّی سے جو آدمی میرے ساتھ آیا تھا اُس کا مقصد صرف یہ تھا کہ مجھے کسی معمولی سے ہوٹل میں داخل کر جائے جہاں مجھے رہنے کے لئے سستا سا کمرہ مل جائے۔ معمولی ہوٹل میں رہنے کی ضرورت یہ تھی کہ کوئی مجھ پہ شک نہ کرے، اور مجھے غریب سا سیلز مین سمجھا جائے۔ وہ میرا رہنما بن کے آیا تھا۔ اُس نے مجھے بازاروں سے واقفیت کرائی اور ایک ہوٹل دکھا دیا۔ اس شہر کے کچھ لوگوں کو وہ جانتا تھا لیکن یہ محض کاروباری جان پہچان تھی۔ ایسی بے تکلفی نہیں تھی کہ مجھے کسی کے حوالے کر جاتا۔ اس ہوٹل میں کھانا کھا کر وہ مجھے یکے بعد دیگرے چھ دکانداروں کے پاس لے گیا۔ ان میں ایک سکھ، چار ہندو اور ایک مسلمان تھا۔ ان سے اُس نے میرا تعارف کرا کے کہا کہ یہ ہمارا نیا سیلز مین ہے۔ فلاں ہوٹل میں ٹھہرا ہے۔ ایک دو دنوں میں کاروباری بات چیت کے لئے آئے گا۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ہُوا کہ چھ گواہ مل گئے جو کہہ سکتے تھے کہ میں دلّی کی فلاں فرم کا نمائندہ ہوں۔ میرے پاس اس فرم کا خط بھی تھا۔ اس تعارف کے بعد میرا یہ

محسن مجھ سے رخصت ہو گیا......

"ہوٹل بالکل معمولی تھا مسلمانوں کا ہوٹل اس سے بہتر ہو بھی نہیں سکتا تھا کھانا واجبی سا تھا اور چھوٹے چھوٹے چند ایک کمرے تھے۔ مجھے یہاں سے فرار کے آخری مرحلے میں داخل ہونا تھا جو زندگی اور موت کا مرحلہ تھا۔ میں نے ہوٹل کے مالک اور کمروں میں رہنے والوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ مجھے آگے کی رہنمائی لینی تھی۔ ہوٹل کا مالک ترش رُو سا آدمی تھا۔ بے تکلف ہونے والی نسل سے نہیں تھا۔ میں نے اس کے ساتھ مشرقی پاکستان کا افسوس کیا تو اُس نے بے رخی سے کہا ۔"ارے بھائی صاحب! میرے ہوٹل میں رہنا ہے تو پاکستان کی کوئی بات نہ کرنا۔ پاکستان تو ہمارے لئے مصیبت بن گیا ہے۔ ایک جنگ ختم ہوتی ہے تو دوسری شروع ہو جاتی ہے۔ یہ شہر خالی ہو جاتا ہے۔ بازار بند ہو جاتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ مشرقی پاکستان کا ٹنٹا ختم ہوا اور ہوٹل دوبارہ کھلا ہے۔ اِدھر کا پاکستان بھی ختم ہو تو چین آئے"......

"اس منحوس انسان نے یہیں پہ بس نہیں کی۔ کہنے لگا۔ "جب سے جنگ ختم ہوئی ہے، روزانہ رات کو پولیس چھاپہ مارتی ہے۔ پولیس کو شک ہے کہ یہاں جاسوس ٹھہرے ہوتے ہیں۔ میں خود بھی نظر رکھتا ہوں کہ یہاں پاکستان کا کوئی جاسوس نہ ٹھہرے"......

"اس نامراد مسلمان سے یہ اطلاع مل گئی کہ پولیس چھاپے مارتی ہے۔ میں نے اپنے کمرے میں جا کر ریوالور چھپانے کا بندوبست کیا۔ فرش اینٹوں کا تھا اور خستہ۔ کونے سے ایک اینٹ اکھاڑی۔ کچھ مٹی نکال کر بیت الخلاء میں پھینکی۔ ریوالور اور گولیاں ایک اخبار میں لپیٹ کر رکھیں اور اوپر اینٹ رکھ دی۔ اس کے نیچے میں نے گڑھا اتنا کھود لیا تھا کہ اینٹ فرش کے ساتھ ہموار ہو گئی پھر میں نے ساتھ کے کمروں کے مکینوں کا جائزہ لیا۔ ایک کمرے میں ایک

کالج کے دو طلبا رہتے تھے۔ وہ کسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ہوسٹل کے اخراجات زیادہ تھے، اس لئے ہوٹل میں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ ہوٹل والے نے انہیں خاصی رعایت دے رکھی تھی، کیونکہ وہ گذشتہ تین سال سے وہاں رہ رہے تھے۔ رات کے وقت میں نے ان کے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھا تو اندر چلا گیا۔ اپنا تعارف دلّی کی اس فرم کے سیلز مین کی حیثیت سے کرایا۔ ظاہر ہے کہ موضوع مشرقی پاکستان تھا۔ مجھے بہت جلدی معلوم ہو گیا کہ لڑکے جوشیلے ہیں اور پکے مسلمان۔ میں نے ان کا یہ رجحان اور جوش دیکھ کر اُس حملے کی باتیں شروع کر دیں جو مغربی پاکستان نے ہندوستان پر کیا تھا۔ ان لڑکوں نے دانت پیس پیس کر کہا کہ وہ امرتسر میں پاکستانی فوج کا انتظار کرتے رہے۔ وہ پاکستان کی فوج کے ساتھ شامل ہو کر کوئی کام کرنا چاہتے تھے مگر فوج آگے آئی ہی نہیں.....

"ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ پولیس کا ایک انسپکٹر، ایک حوالدار اور دو سپاہی کمرے میں آ گئے۔ انسپکٹر نے کچھ کہے بغیر لڑکوں کا ایک ٹرنک کھولا اور کپڑے اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔ حوالدار نے الماری کھولی اور کتابیں ہٹا کر دیکھنے لگا۔ انسپکٹر نے ٹرنک سے ہٹ کر مجھ سے پوچھا ۔"تم کہاں سے آئے ہو؟ کون ہو؟" ۔ میں نے اُسے بتایا کہ دلّی سے آیا ہوں۔ فرم کا لیٹر اُسے دکھایا اور اُن چھ دکانداروں کے نام لے کر بتایا کہ انہیں مل چکا ہوں۔ آرڈر لے کر چلا جاؤں گا۔ انسپکٹر نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پوچھا کہ میرا کمرہ کون سا ہے۔ وہ مجھے میرے کمرے میں لے گیا اور رسمی سی معذرت بھی نہ کی۔ میرا اٹیچی کیس کھولا۔ فرم کی مصنوعات کے نمونے کپڑوں کے اوپر رکھے تھے۔ اُس نے اٹیچی کیس خالی کر کے دیکھا۔ الماری کھولی۔ وہ خالی تھی۔ بستر اٹھا کر دیکھا اور پھر اُس نے میرے جسم پر ہاتھ پھیرے۔ یہ میری جامہ تلاشی ہو رہی تھی۔ اُس نے کہا ۔"دیکھو مسٹر! اپنا کام جلدی کر کے یہاں سے نکل جانا" ۔ میں نے

اس سے پوچھا ۔ "آپ کو غالباً مسلمانوں پر زیادہ شک ہے"....

"جی!" اُس نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا ۔ "امرتسر کے آدھے
مسلمان پاکستان کے جاسوس ہیں۔ کوئی گھروں میں رہتے ہیں اور کوئی ہوٹلوں
میں ہم سانپ کے بچے پر اعتبار کر لیتے ہیں مسلمان کے بچے پر ایک دھیلے
جتنا بھی ہم اعتبار نہیں کرتے" ۔ اور وہ مسلمانوں کو گالیاں بکتا آگے چلا گیا۔
خدا کا شکر ہے کہ میں نے ریوالور چھپا دیا تھا......

"تمام کمروں میں سے گھوم پھر کر پولیس چلی گئی تو دونوں لڑکے میرے
کمرے میں آ گئے ۔ غصے سے ان کے چہرے سرخ ہوئے جا رہے تھے۔ ایک
لڑکے نے کہا ۔ "یہ لوگ ہمیں جاسوس اور چور سمجھتے ہیں۔ ہم کبھی کبھی پاکستان
کی حکومت اور فوج پر لعنت بھیجا کرتے ہیں جو سرحد پر ہی لڑتے رہتے ہیں، آگے
نہیں آتے۔ میں نے یہاں ہندوستان کے فوجیوں کے ساتھ کئی بار باتیں کی ہیں۔
وہ پاکستان کی فوج سے ڈرتے ہیں اور وہ جنگ سے بھی ڈرتے ہیں، ان کے
دلوں میں ذرہ بھر ایسا جذبہ نہیں کہ وہ پاکستان کو فتح کریں گے"......

"دوسرے لڑکے نے کہا ۔ "ہم پاکستان کے لئے جاسوسی کرنے کے لئے
تیار ہیں اور اگر پاکستان یہاں گوریلے اور کمانڈو بھیجے تو ہم ان کی مدد بھی کریں گے
اور اُن کی طرح تباہی بھی مچائیں گے۔ ہمیں پاکستان گرنیڈ اور اسلحہ دے دے
لیکن حملہ کر کے فائر بندی نہ کر دے۔ خدا کی قسم، مسلمان لڑکے پاکستانی فوج
کا راستہ صاف کرتے جائیں گے"......

"یہ نوجوان تھے۔ جوش سے بھرے ہوئے تھے۔ مشرقی پاکستان کا نام لیتے
تھے تو اُن کی مٹھیاں بند ہو جاتی تھیں اور جوش سے ان کے دانت پسنے لگتے
تھے۔ ایک لڑکے نے کہا ۔ "اگر پاکستان ہمت کرے تو ہم مشرقی پاکستان کے بدلے
مشرقی پنجاب کو پاکستان میں شامل کر سکتے ہیں۔ بنگالی مسلمانوں نے مشرقی پاکستان
میں جو نقصان پاکستانی فوج کو پہنچایا ہے، اسی طرح کا نقصان ہم یہاں کے مسلمان

ہندوستانی فوج کو پہنچا سکتے ہیں۔ ہمیں پاکستان سے صرف یہ یقین دہانی ہو جائے
کہ اُس کی فوج جب حملہ کرے گی تو پیچھے نہیں ہٹے گی، اور فائر بندی نہیں کرے گی"....

"اُن لڑکوں کا یہ جذبہ میرے کام آ سکتا تھا۔ خطرہ صرف یہ تھا کہ یہ لڑکے
صرف جذباتی ہو سکتے تھے۔ میں نے انہیں آزمانے کے لئے کچھ باتیں کیں۔ مجھے
یقین سا ہونے لگا کہ لڑکے ہوشیار ہیں اور ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔
ان کے ساتھ باتیں کرتے تین گھنٹے گذر گئے تھے۔ میں نے آخر انہیں کہا۔
'میں سرحد پار کرنا چاہتا ہوں'۔ انہوں نے وجہ پوچھی تو میں نے انہیں بتا دیا
کہ میں مشرقی پاکستان سے آ رہا ہوں۔ پھر میں نے انہیں اپنی پوری کہانی سنا دی
کہ میں کس طرح پاک فوج کو سامان سپلائی کرتا رہا ہوں اور کس طرح وہاں سے
نکلا ہوں۔ کلکتے، مغل سرائے اور دلی کے میزبانوں کے متعلق بھی بتایا۔ لڑکے
میری آپ بیتی سے اتنے متاثر ہوئے کہ میری مدد کے لئے تیار ہو گئے مگر مجبوری
یہی تھی کہ مجھے ہندوستانی فوج کے مورچوں سے نہیں گزار سکتے تھے۔ ان دونوں
کا گاؤں سرحد سے سات اور آٹھ میل کے درمیان تھا۔ جنگ کے دوران
یہ دیہاتی علاقہ خالی ہو گیا تھا۔ پاکستانی توپوں کے گولے دور دور تک پہنچے
تھے۔ پاک فوج کی پیشقدمی کا بھی خطرہ تھا۔ فائر بندی ہوتے ہی دیہاتی اپنے
گھروں کو واپس چلے گئے تھے۔ یہ دونوں لڑکے مدد کے لئے تیار ہو گئے اور
مجھے ان پر اعتماد آ گیا۔ میں نے ان کے ساتھ فرار کی سکیم بنانی شروع کر دی۔
میں نے ان کے متعلق یقین کر لیا تھا کہ دھوکا نہیں دیں گے مگر یہ یقین سو فیصد
نہ تھا۔ اس کے علاوہ یہ خطرہ بھی نظر آ رہا تھا کہ وہ نوعمر ہیں۔ انکے پاس تجربے
کی جگہ جذبات تھے۔ ان خطروں کو میں نے قبول کر لیا اور کوئی چارہ کار
نہ تھا......

"میرے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ میں شہر سے نکل کر سرحد تک کس طرح جاؤں گا۔

لڑکوں نے حل کر دیا۔ دوسرے ہی دن ان میں سے ایک لڑکا کالج نہ گیا۔ وہ مجھے شہر میں لے گیا۔ وہاں سے ہم بس میں بیٹھے۔ میں پتلون اور جیکٹ میں تھا۔ ریوالور فرش سے نکال کر ٹانگ کے ساتھ، پتلون کے اندر باندھ لیا تھا۔ میں نے لڑکے سے کہا کہ دیہات میں اس لباس سے شک ہوگا۔ اس نے بتایا کہ ان کا گاؤں اتنا پسماندہ نہیں۔ پتلون عام پہنی جاتی ہے..... ہم تھوڑی سی دیر میں اُس کے گاؤں میں داخل ہو گئے۔ راستے میں بہت سے فوجی نظر آئے۔ لڑکے کے والد صاحب گھر تھے۔ اُن کے ساتھ تعارف ہوا۔ وہ روشن خیال زمیندار تھے، ان کی باقاعدہ تعلیم تو کم تھی، مطالعہ اچھا معلوم ہوتا تھا۔ ان کے دو بیٹے اور بھی تھے جو اس روز گھر نہیں تھے۔ اُن کے اس لڑکے نے جو مجھے ساتھ لے گیا تھا انہیں میرے متعلق صرف اتنا بتایا کہ مشرقی پاکستان سے آئے ہیں اور پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ والد صاحب میری عمر کے تھے۔ حیران ہو کر مجھے گھورنے لگے۔ میں ان کی نظروں سے ڈر گیا جیسے مجھے پکڑوا دیں گے۔ وہ نہ جانے کیا سوچ رہے تھے کہ میں نے ہتھیار ڈالنے کے روز سے لے کر اس گاؤں میں داخل ہونے تک کی روئیداد سنا دی۔ وہ انہماک سے سنتے رہے۔ آخر بولے — ”اگر آپ مجھے ہندوستان میں کسی بھی جگہ ملتے تو میں آپ کی اس سے زیادہ مدد کرتا۔ یہاں آپ دیکھ لیں کہ سرحد تک فوج مورچوں میں بیٹھی ہے۔ آپ کو یہاں رکنا پڑے گا۔ کوئی صورت نکالیں گے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ کو کب یہاں سے نکال سکوں گا۔ اگر سال دو سال لگ گئے تو بھی آپ کو اپنے پاس رکھوں گا، کوئی فکر نہ کریں۔ جلد بازی سے کام نہیں لیں گے“.....

”لڑکا واپس امرتسر چلا گیا۔ میں گاؤں میں غیر یقینی سی حالت میں رہ گیا۔ گاؤں خاصا بڑا تھا۔ میری داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ امرتسر کے ہوٹل میں مجھے پولیس نے دیکھا تھا۔ میں نے اپنا حلیہ بدلنے کے لیے داڑھی اور مونچھیں صاف کرا دیں۔ پتلون اور جیکٹ اتار کر شیروانی اور پاجامہ پہن لیا۔ میرے میزبان نے مجھے شلوار دے دی کیونکہ پنجاب کے دیہات میں پاجامے کا رواج نہیں۔ اس گاؤں میں عجیب بات یہ دیکھی کہ اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ اگست ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا تو یہاں سے مسلمان پاکستان کی طرف بھاگے۔ بہت سے قتل ہو گئے اور کچھ ایسے بھی تھے جو پاکستان نہ گئے وہ گھر اور زمینیں چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اُس وقت بھی اس گاؤں میں مسلمان زیادہ آباد تھے۔ ان کے چلے جانے یا شہید ہو جانے سے گاؤں خالی ہو گیا۔ مشرقی پنجاب کے پچھلے دیہات سے مہاجرین چلے آ رہے تھے۔ یہ سلسلہ نومبر اور دسمبر تک بھی جاری تھا۔ ہندوستان کی حکومت نے انہیں روک لیا اور ان میں سے جو رضامند ہوئے انہیں اس گاؤں میں بھیج دیا۔ کچھ مسلمان خود ہی یہاں آ کر رک گئے اور گاؤں میں پھر سے مسلمان آباد ہو گئے۔ میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ ہندوستانی حکومت نے مہاجرین کو پاکستان جانے سے روکا اور یہاں آباد کیا ہوگا۔ بہرحال اس گاؤں میں زیادہ تر مسلمان یہاں کے قدیم باشندے نہیں تھے۔ میں نے گاؤں میں گھوم پھر کر کچھ بھی نہیں دیکھا۔ مجھے یہ سب کچھ بتایا جا رہا تھا۔ گاؤں کے ایک حصے میں ہندو اور سکھ آباد تھے۔ ہندوؤں کی نسبت سکھ زیادہ تھے.....

”یہاں بھی مجھے وہی باتیں سننی پڑیں جو میں کلکتہ، مغل سرائے اور دلّی کے میزبانوں سے سن آیا تھا۔ گاؤں کی اس معزز شخصیت نے بھی انہی جذبات کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کا سارا دن ہم چھتوں پر اس انتظار میں کھڑے رہے کہ ہندوستانی فوج پسپا ہو کر ادھر سے گزرے گی، اور اس کے پیچھے پاکستانی فوج آ رہی ہوگی مگر ہم انتظار کرتے رہے۔ یہاں کسی نے بھی یہ نہ کہا کہ گاؤں خالی کر دو۔ بہت سے لوگ اپنے طور پر گاؤں سے چلے گئے۔ یہ صاحب بھی کہتے تھے کہ وہ پاکستانی فوج کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ ان کی اراضی سکھوں کے رحم و کرم پر تھی۔ سکھوں نے پانی لگانے کی باری دے دی تو

انہوں نے لگا لیا ورنہ وہ اپنی باری کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے۔ پاری کے علاوہ اور بہت سی بے انصافیوں کا شکار ہیں۔ یہ لوگ چونکہ سرحد کے قریب آباد ہیں اس لئے ان پر نظر رکھی جاتی ہے کہ پاکستان کے ساتھ رابطہ نہ رکھیں۔ میرے میزبان نے بتایا کہ ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کی شام پاکستان نے حملہ کیا تو ساری رات پاکستان کی بڑی توپوں کے گولے پھٹتے رہے۔ وہ چھتوں پر چڑھ کر پھٹتے گولوں کی روشنی دیکھتے رہے۔ گولے ان سے ڈیڑھ دو میل جنوب کی طرف پھٹ رہے تھے۔ گاؤں کے ہندو اور سکھ بھی مسلمانوں کے گھروں میں آگھسے۔ وہ پناہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ ہندو میرے میزبان کے پاس بھی آئے تھے اور اس قسم کی باتیں کی تھیں کہ دیکھو چوہدری صاحب ہم نے آپ کو کبھی پریشان نہیں کیا۔ ہمارے خلاف کوئی شکایت ہو تو ہمیں معاف کر دینا۔ پاکستان کی فوج ایک دو دنوں میں آجائے گی۔ ہمارے بال بچوں کو اپنے گھر میں رکھ لو بہت سے تو بھاگ ہی گئے تھے مگر جنگ کا جو انجام ہوا اس نے مسلمان چوہدریوں کی پگڑیاں ہندوؤں اور سکھوں کے قدموں میں پھینک دیں۔۔۔۔۔

"میں ان لوگوں سے ایسی ہی باتیں کہتا سنتا رہتا تھا۔ تین دن گزر گئے۔ ڈر یہ تھا کہ سول پولیس یا ملٹری پولیس نہ آجائے۔ میرے میزبان نے تیسرے دن مجھے کہا کہ گاؤں کے کسی اور دانشمند آدمی کو اپنے راز میں شریک کرنا پڑے گا تاکہ کوئی ایسی ویسی صورت پیدا ہو جائے تو کسی اور کو بھی مدد کے لئے کہا جا سکے۔ وہ باہر چلے گئے اور شام کے بعد ایک آدمی آیا۔ وہ بھی میری عمر کا تھا۔ میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اُسے میزبان نے میرے متعلق سب کچھ بتا دیا تھا۔ یہ آدمی واقعی دانشمند تھا۔ ہم اندر کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ آدمی باتیں کرتے کرتے چپ ہو گیا اور مجھے بڑی ہی گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں گھبرا گیا۔ وہ زیرِ لب مسکرایا اور آہستہ سے بولا۔

"تم نے اپنا نام رئیس الدین بتایا ہے۔ تم رہنے والے کہاں کے ہو؟ بنگالی

تو نہیں ہو؟۔۔۔۔۔

"نہیں جی"۔۔ میں نے جواب دیا۔ "میں انہیں (میزبان کو) ساری بات سنا چکا ہوں۔ میں رانچی کا رہنے والا ہوں۔ وہاں سے ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے مشرقی پاکستان گیا تھا"۔۔۔۔۔

"یہ اتنی اچھی پنجابی زبان کہاں سے سیکھی ہے؟"۔۔ اس نے پوچھا۔

"میں سُن ہو کے رہ گیا۔ پنجاب میں آ کر میں نے غیر دانستہ طور پر پنجابی بولنی شروع کر دی تھی۔ میرا میزبان نہیں بھانپ سکا تھا کہ میں اپنے آپ کو بہاری بتا رہا تھا، لیکن زبان پنجابی بول رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے امرتسر پولیس والوں کے ساتھ اُردو میں باتیں کی تھیں۔ لڑکوں کے ساتھ بھی اُردو بولتا رہا تھا۔ گاؤں میں آ کر اس دیہاتی ماحول کا ایسا اثر ہوا کہ میں نے لاشعوری طور پر پنجابی بولنی شروع کر دی۔ اس آدمی نے پوچھا کہ پنجابی زبان کہاں سے سیکھی ہے تو میں خاموش ہو گیا۔ دماغ خالی ہو گیا۔ میں نے جواب سوچ لیا لیکن میری خاموشی نے شک پیدا کر دیا تھا۔ اس آدمی نے کہا۔۔ "یار! اللہ جھوٹ نہ بلوائے۔ بعض انسانوں کی شکلیں ایک جیسی بھی ہوتی ہیں لیکن تم رئیس الدین تو نہیں ہو"۔۔ اُس نے میرا تئیس سال پرانا اور اصل نام لے کر کہا کہ تم وہ تو نہیں؟ میں نے اس آپ بیتی میں اپنا اصل نام جو ماں باپ نے رکھا تھا اور بیوی کے قتل تک مجھے جس نام سے لوگ پکارا کرتے تھے ظاہر نہیں کیا۔ رئیس الدین وہ نام ہے جو میں نے امرتسر کے بھرتی دفتر میں لکھوایا تھا۔ اس کے بعد میرا یہی نام رہا۔ میں اب بھی اپنا پرانا نام نہیں بتاؤں گا جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس نام کے ساتھ بڑی ہی تلخ یادیں وابستہ ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ میرا نام جاننے والا کوئی پاکستان میں ہے تو وہ مجھے نہ جان سکے۔ میرے اس راز سے میری دوسری بیوی عائشہ اور میری اولاد آگاہ ہے۔۔۔۔۔

"اس آدمی نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔ "اگر تم وہی ہو تو تم نے مجھے پہچان لیا ہوگا۔ تمہیں پہچاننے میں مجھے غلطی نہیں لگ سکتی۔ تمہارا یہ قد بُت اور یہ تمہارا یہ چہرہ ابھی بیس سال اور بوڑھا نہیں ہوگا۔"

"میں نے اُسے پہچان لیا۔ تیس برسوں کے فاصلے مٹ گئے اور مجھے اپنی برادری کا ایک بوڑھا آدمی جوان نظر آنے لگا۔ تیس سال پہلے وہ اس گاؤں کا رہنے والا نہیں تھا۔ وہ میرے قصبے کا رہنے والا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اُس نے اگست ۱۹۴۷ء میں ہجرت نہیں کی تھی اور اُس وقت اپنے گاؤں سے نکلا جب وہاں عرصہ حیات تنگ ہو گیا مگر پاکستان جانے کی بجائے اس گاؤں میں رک گیا..... میں نے اُس کی پہچان کی تردید نہیں کی۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے داڑھی منڈھوا کر غلطی کی ہے۔ اب مجھے یہ توقع تھی کہ یہ آدمی غصّے سے پھٹ کر میرے میزبان سے کہے گا۔۔۔ "یہ بھگوڑا قاتل ہے۔ اپنی بیوی کو قتل کر کے بھاگا تھا"۔۔۔ اور پھر وہ مجھے پولیس کے حوالے کر دے گا اور اگر اُس کے دل میں رحم آگیا تو پولیس کے حوالے شاید نہ کرے لیکن یہ ضرور کہے گا کہ جا بُزدل! ہم تجھ جیسے آدمی کی کوئی مدد نہیں کریں گے۔ مجھے سب سے بڑا خطرہ یہ نظر آیا کہ میری پہلی بیوی کے بھائی بھی اسی گاؤں میں ہوں گے۔ وہ اپنی بہن کے قتل کا انتقام لیں گے۔ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے......

"میرا سر جھک گیا۔ مجھے سارے ہندوستان کا اتنا خطرناک سفر ضائع ہوتا نظر آیا۔ میں کس جذبے سے مشرقی پاکستان سے نکلا تھا۔ وہیں اپنے آپ کو ہندوستانی فوج کے حوالے کر دیتا تو قیدی کیمپ میں زندہ تو رہتا مگر میں ایسی منزل پر آن پھنسا تھا جہاں میری حیثیت قاتل کی ہو گئی۔ میرے آنسو نکل آئے۔ وہ آدمی اٹھا۔ مجھے کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور میرے ساتھ بغلگیر ہو گیا۔ ذرا سی دیر کے لئے مجھے یوں لگا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ یہ کیسی

ملاقات تھی؟ یہ کیا تھا؟ زندگی میں اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز واقعات ہوتے ہیں، مگر میں یہ تسلیم نہیں کرنا چاہتا تھا کہ تیس سال بعد میری ملاقات ایسے آدمی کے ساتھ ہو جائے گی جو مجھے جانتا ہے اور میرے اس راز سے بھی واقف ہے جس سے میں بھاگا ہُوا تھا.....

"تم اب بھی اُتنے ہی بدھو ہو؟" اُس نے پوچھا لیکن میرے ہونٹ سِل گئے تھے یا شاید زبان اکڑ گئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "میں نے غلط تو نہیں پہچانا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ میرے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میں نے آنسو پونچھے اس نے پوچھا۔ "جانتے ہو۔ اُس کا پیچھے کیا حال ہُوا تھا؟"

"کس کا؟" میں نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ارے یار، تمہاری بیوی کا"۔۔۔ اس نے کہا۔ اب مجھے یہی توقع تھی کہ وہ کہے گا کہ لوگوں نے چوتھے پانچویں روز اُس کی لاش کمرے سے اٹھائی۔ کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ اندر مری پڑی ہے اور تم گھر میں نہیں ہو۔ محلے میں بدبُو پھیلی تو اندر جا کر دیکھا۔ تمہاری بیوی کی سوجی ہوئی لاش پڑی تھی.... مگر اُس نے یہ کہہ کر مجھ پر سکتہ طاری کر دیا۔۔۔ "رات کے وقت اُس نے اپنے ماں باپ کے گھر جا کر وہ شور مچایا کہ محلے برادری کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ وہ پِلّا رہی تھی۔۔۔ اُس مردود نے میرا گلا دبایا ہے۔ میں بے ہوش ہو گئی۔ جب ہوش آئی تو وہ گھر میں نہیں تھا"۔۔۔ اس آدمی نے مجھ سے پُوچھا۔ "تم کہاں چلے گئے تھے؟"

"بھاگ گیا تھا"۔۔۔ میں نے جواب دیا اور ذرا ڈرتے ڈرتے پوچھا۔۔۔

"وہ اپنے گھر چلی گئی تھی؟"

"تو اور کہاں جاتی؟"۔۔۔ اُس نے کہا اور میرے میزبان سے مخاطب ہو کر کہا۔۔۔ "چوہدری صاحب! آپ حیران ہوتے ہوں گے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ یہ شخص (میں) ہماری برادری کا آدمی ہے۔ جنگِ عظیم کے زمانے میں اس کی شادی ہوئی۔

اس کی بیوی انسان کی بچی نہیں لگتی تھی اور یہ بے چارا سیدھا سادا اور بھلا مانس۔
ہمیں معلوم تھا کہ لڑکی اسے تنگ کر رہی ہے۔ اس کا اپنا سگا کوئی بھی زندہ نہیں
تھا۔ اس کے پڑوسی بتاتے رہتے تھے کہ لڑکی اس کا کیا حال کرتی رہتی تھی اور یہ کس
طرح سر جھکا کر برداشت کرتا تھا۔ آخر ایک روز یہ گھر سے ہی بھاگ گیا۔ لڑکی نے
رات کے وقت وہ شور مچایا کہ دنیا اکٹھی کر لی اور سب کو بتایا کہ مجھے خاوند نے
مارا پیٹا ہے اور پھر اُس نے میرا گلا گھونٹ دیا۔ میں بے ہوش ہو گئی۔ ہوش میں آئی
تو میں فرش پر پڑی تھی اور خاوند غائب تھا... چوہدری صاحب! ساری برادری
جانتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ خود اُس کے باپ نے اُس پر یقین نہیں
کیا۔ وہ اپنی بیٹی کو جانتا تھا کہ یہ انسان نہیں چڑیل ہے۔ اس کے بعد اس آدمی
کا کچھ پتہ نہیں چلا کہ کہاں چلا گیا۔ میرا تو یہ لنگوٹیا تھا۔ اس نے مجھے پہچانا نہیں۔"

"میں تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ میری پہلی بیوی مری نہیں تھی۔ میں نے
اُس کا گلا اتنی زور سے دبایا تھا کہ جب میں نے اُسے چھوڑا وہ گر پڑی تھی۔ میں
اُسے مردہ سمجھ کر بھاگ گیا تھا لیکن اس آدمی کو مجھے پہچاننے میں غلط فہمی ہوئی ہے
مگر اُس نے میرا نام، میری پہلی بیوی کا نام، اُس کے باپ کا نام اور ہمارے
قصبے کا نام صحیح بتایا تھا۔ میں نے اس آدمی کو پہچان بھی لیا تھا۔ پھر میں نے
اس کے ساتھ جو باتیں کیں ان سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی غلط فہمی نہیں۔
میں نے اُسے یہ نہیں بتایا کہ میں نے واقعی پہلی بیوی کا گلا گھونٹا تھا بلکہ یہ
بتایا کہ اُس رات اُس نے میری اتنی زیادہ بے عزتی کی تھی کہ میں گھر سے بھاگ
گیا۔ میں اُسے طلاق دینا چاہتا تھا مگر اُس کا باپ مجھے انتقام کی دھمکیاں دیتا
تھا۔ بہر حال مجھے یہ اطمینان ہوا کہ میں قاتل نہیں......

"وہ اب کہاں ہے؟" ــ میں نے اپنی پہلی بیوی کے متعلق پوچھا۔

"تمہارے جانے کے پچھلے سال مر گئی تھی" ــ اُس نے جواب دیا۔

"بڑی عجیب موت مری اور خدا نے اُسے بڑی سخت سزا دی تھی۔ اُس کے
ماں باپ در پردہ کوشش کرتے رہے کہ اُس کی دوسری شادی کر دیں مگر اسے
کسی نے قبول نہیں کیا۔ ایک تو لڑکی کی عادتوں سے سب واقف تھے اور
دوسری وجہ یہ تھی کہ سب کہتے تھے کہ اس کا خاوند زندہ ہے، معلوم نہیں
کب واپس آ جائے۔ دو سال بعد لڑکی کے چال چلن کی لوگ باتیں کرنے لگے۔
وہ کسی کے ساتھ خراب ہو گئی تھی۔ اس کے بعد بہت ہی بدنام ہو گئی۔ یہ
بدنامی جھوٹ نہیں تھی۔ لڑکی بہت خراب ہو گئی تھی۔ ایک روز پتہ چلا کہ لڑکی
کو ہیضہ ہوا ہے اور مر گئی ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ ہیضہ نہیں ہوا، بھائیوں نے
اسے زہر دیا ہے۔ اُسے بڑی جلدی دفن کر دیا گیا تھا۔ برادری کو معلوم تھا کہ
لڑکی کیسی ہے۔ کسی نے بھی منہ سے ایسی بات نہیں نکالی کہ لڑکی کو مارا گیا ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ اُسے بھائیوں نے زہر دیا تھا۔ اُس کے ماں باپ مر چکے
ہیں۔ ایک بھائی اگست سنتالیس کے فساد میں مارا گیا تھا۔ دوسرا خاندان کے
کچھ افراد کو پاکستان لے گیا تھا۔ ہم پھنسے رہ گئے۔ وہاں سکھوں نے سب کچھ جلا
دیا تو ہم یہاں آ گئے۔ گاؤں خالی پڑا تھا۔ ہم یہیں آباد ہو گئے"......

"مجھے جوانی کا تلخ دور یاد آ گیا، لیکن یہ وقت جذبات میں الجھنے والا
نہیں تھا۔ میں نے اپنے ان میزبانوں سے صلاح مشورہ شروع کر دیا کہ پاکستان
تک کس طرح پہنچوں۔ اس آدمی نے بڑے تحمل سے کہا ــ "گھبراؤ نہیں۔ اللہ
مالک ہے۔ دو دن انتظار کرو" ــ اُس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس معاملے
کے متعلق سنجیدہ یا متفکر نہیں۔ مجھے تسلی دیتا رہا کہ کوئی نہ کوئی بندوبست ہو
جائے گا...... دوسرے ہی دن بندوبست ہو گیا۔ یہی آدمی اگلی شام آیا اور
ایک کاغذ میرے آگے رکھ کر بولا ــ "آگے تمہاری قسمت ہے۔ ہم کچھ نہیں
کہہ سکتے کہ اللہ کو کیا منظور ہے۔ یہ مخدوش سا علاقہ ہے۔ رات کے وقت اس

میں سے گزر جاؤ۔ اس علاقے کے تین چار سو گز دائیں اور اتنا ہی بائیں کوئی فوجی مورچہ نہیں ہے کیونکہ جنگ کا زور دائیں اور بائیں تھا۔ چار پانچ میل پر دریائے راوی آجائے گا۔ سردیوں کا موسم ہے۔ دریا میں پانی کم ہے۔ دریا میں اُتر جانا۔ کنارے اونچے ہیں۔ اِس طرف سے بائیں کنارے کی اوٹ میں چلو گے تو کسی کو نظر نہیں آؤ گے لیکن دن کے وقت نہیں۔ رات کو۔ دریا تمہیں سرحد پار کرا دے گا۔ تمہیں دریا میں دو تین میل چلنا پڑے گا۔ تمہیں ایک بہت چوڑی نہر نظر آئے گی۔ اسے بمبانوالی نہر یا بی آر بی کہتے ہیں۔ وہ پاکستان کا علاقہ ہے۔ آگے تمہاری مرضی۔ فوجیوں کے پاس چلے جاؤ، کہیں اور چلے جاؤ وہ تمہارا اپنا پاکستان ہے“۔۔۔۔

”وہ مجھے بتا نہیں رہا تھا کہ اُس نے یہ معلومات کس سے حاصل کی ہیں۔ مجھے اعتبار نہیں آرہا تھا۔ آخر اُس نے مجھے یہ کہہ کر یقین دلایا کہ سرحد کے ساتھ ساتھ دونوں طرف جو گاؤں ہیں وہاں سمگلر موجود ہیں جو دونوں ملکوں کے ہیں۔ ان کیلئے سرحد اور فوجی مورچے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ جنگ ختم ہوئے ابھی ایک مہینہ ہُوا ہے۔ سمگلروں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔۔۔۔ اس آدمی نے راستے کی معلومات ایک سمگلر سے حاصل کی تھیں جو گاؤں میں موجود تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ چُھپ کر چلنے کے لئے کھیت ہیں۔ کھڈ اور خشک نالے بھی ہیں۔ سرکنڈوں کا جنگل بھی ہے لیکن کماد اور سرکنڈوں میں چلنے کے لئے یہ احتیاط لازمی تھی کہ آواز پیدا نہ ہو۔۔۔۔ میں نے کاغذ پر پنسل سے بنا ہُوا نقشہ ازبر کر لیا اور اُسی رات روانگی طے ہو گئی۔ اٹیچی کیس ساتھ اٹھانا ٹھیک نہیں تھا۔ پتلون اور جیکٹ پہنے رکھی، کیونکہ اس سے چلنے اور بھاگنے میں آسانی تھی۔ ریوالور پنڈلی کے ساتھ باندھ لیا۔ اس میں چھ گولیاں تھیں۔ باقی گولیاں پتلون کی جیبوں میں ڈال لیں۔ میرے پاس نوٹوں کی شکل میں جو رقم تھی وہ ہندوستانی کرنسی تھی۔ یہ بھی پاس رکھ لی۔ باقی کپڑے، کلکتے والے میزبانوں کا پاجامہ کرتہ اور کمبل، مغل سرائے والوں کی شیروانی

اور دلّی والوں کی شلوار وغیرہ اٹیچی کیس میں رکھ کر ان آخری میزبانوں کے گھر چھوڑ کر میں رات کے پہلے پہر گاؤں سے نکلا۔ دونوں میرے ساتھ تھے۔ وہ دور تک میرے ساتھ آئے۔ ایک جگہ رُک کر انہوں نے بغلگیر ہو کر مجھے رخصت کیا۔ میرے آنسو نکل آئے۔ میرے میزبان نے کہا۔ ”اپنی فوج کے جرنیلوں سے کہنا کہ سرحد پار کرو، ہم تمہیں پورے کا پورا مشرقی پنجاب دیں گے۔ یہاں کے مسلمان تمہارے ساتھ ہوں گے“۔۔۔ یہ پیغام ہندوستان کے سارے مسلمانوں کا تھا جو مجھے تین جگہوں سے ملا تھا۔۔۔۔

”میں اندھیرے میں کماد کے دو کھیتوں کے درمیان مینڈھ پر چلتا گیا۔ کان ارد گرد کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ کوئی انسانی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ کماد کے کھیت ختم ہو گئے۔ دوسرے کھیت آگئے۔ میری رفتار سست ہو گئی کیونکہ اوٹ ختم ہو گئی تھی۔ صرف اندھیرا میری مدد کر رہا تھا۔ آگے ویران علاقہ آگیا۔ جھاڑیاں اور سرکنڈے تھے جو زیادہ گھنے نہیں تھے۔ درخت بھی تھے۔ زمین اونچی نیچی تھی۔ کھڈ بھی تھے۔ وہاں مجھے زیادہ محتاط ہو کر چلنا پڑا۔ کبھی میں درخت کے تنے کی اوٹ میں ہو جاتا اور کبھی بیٹھ جاتا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ اس علاقے میں فوج نہ ہو۔ میں فوجی نہیں تھا، اس لئے فوجی باتوں کا علم نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق میں دریا سے زیادہ دور نہیں تھا اور یہاں مورچہ کا ہونا ضروری تھا۔ اگر میں وہاں پکڑا جاتا تو میرا کوئی بہانہ مجھے ہندوستانی فوجیوں سے رہائی نہیں دلا سکتا تھا۔ میں سیدھا کسی ہندوستانی جیل خانے میں بند ہو جاتا اور ہندوستانیوں کی اذیتوں سے مر جاتا۔ مجھے اپنا یہی انجام نظر آرہا تھا۔ میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ مجھے دھیمی دھیمی باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں دبک کر بیٹھ گیا۔ آوازیں قریب آرہی تھیں۔۔۔۔

”پھر دبے دبے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دو آدمی خراماں خراماں چلے آرہے ہوں۔ آوازیں اور قریب آئیں تو پتہ چلا کہ میرے

سامنے سے کوئی گزر رہا ہے۔ گزرنے والے قریب سے گزرے وہ فوجی تھے۔ ایک فوجی اپنے ساتھی کو اپنے گھر یا گاؤں کا کوئی قصہ سنا رہا تھا۔ وہ ذرا آگے نکل گئے تو ذرا دور سے آواز سنائی — "اوئے آہستہ چلو" — ان کے پیچھے بھی کوئی آ رہا تھا۔ اگلے رک گئے۔ ایک نے اپنی بات جاری رکھی۔ وہ رہتک حصار کی زبان بول رہا تھا۔ پیچھے والے آ گئے۔ ان میں سے ایک پنجابی بول رہا تھا۔ اس نے کہا "تمہیں جلدی کیا ہے؟ ابھی پون گھنٹہ رہنا ہے۔ جلدی پہنچ گئے تو ایک راؤنڈ اور لگانا پڑے گا" — ایک اور نے کہا — "یہیں بیٹھو تھوڑی دیر۔ کون سی جنگ لگی ہوئی ہے" — اور وہ چاروں بیٹھ گئے۔ یہ گشتی ڈیوٹی دے رہے تھے۔ ان کی باتوں سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ ذرا دور جائیں گے۔ میں اُن کے چلے جانے کے انتظار میں وہیں بیٹھا رہا۔

"وہ کم و بیش آدھا گھنٹہ وہاں بیٹھے رہے میں اُن سے زیادہ سے زیادہ پندرہ قدم دور تھا۔ یہ آدھا گھنٹہ آدھے مہینے کے برابر تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ فوجیوں کی کوئی اور پارٹی آ جائے گی... خدا خدا کر کے وہ اٹھے اور جب وہ پندرہ بیس قدم آگے چلے گئے تو میں اٹھ کر آگے گیا۔ یہ خشک نالہ تھا جس میں سے وہ گزرے تھے۔ مجھے سیدھا جانا تھا۔ میں نے تین چار منٹ انتظار کیا اور دبے پاؤں نالے سے پار چلا گیا۔ اگلا کنارہ اونچا تھا۔ مجھے اوپر چڑھنے کے لئے تھوڑی دور دائیں طرف جانا پڑا۔ اوپر گیا تو یہ سرکنڈوں کا جنگل تھا۔ اس میں سے گزرنا خطرناک تھا کیونکہ خشک سرکنڈے آواز پیدا کرتے تھے۔ میں نے رک کر کان لگائے۔ کوئی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ اچانک بڑی خوفناک آواز سنائی دی جیسے کوئی درندہ غرایا اور بھونکا ہو۔ میں ڈر گیا کہ یہ بھیڑیا ہو گا۔ آواز کے ساتھ ہی تیز دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے اندھیرے میں سائے سے بھاگتے دیکھے۔ یہ جنگلی سور لگتے تھے۔ وہ مجھ سے دور چلے گئے تھے۔ میں نے رکنا مناسب نہیں سمجھا سرکنڈوں میں گھس گیا اور نہایت آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ رات کی خاموشی میں ان کی آواز بہت اٹھتی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ جنگل دور تک نہیں گیا تھا۔ دس بارہ قدموں پر ختم ہو گیا۔ آگے پھر سرکنڈے تھے لیکن گھنے نہیں تھے...

"مجھے اب دریا کے کنارے ہونا چاہیئے تھا۔ میں ٹھیک سمت پر جا رہا تھا۔ میں موت کے منہ میں داخل ہو چکا تھا۔ اب کوئی بھی قدم مجھے موت کے پیٹ میں لے جا سکتا تھا۔ میں سرکنڈوں میں سے گزرتا گیا، اور میرے پاؤں ریت میں دھنسنے لگے۔ میں چلتا گیا اور آگے پانی آ گیا۔ یہ دریا تھا۔ میں بائیں طرف مڑا اور پانی کے رخ پر چلنے لگا۔ پھر پانی سے ہٹ گیا اور کنارا دیکھنے لگا جس کے متعلق مجھے بتایا گیا تھا کہ اونچا ہے۔ یہ کنارہ اونچا تو نہیں تھا۔ میں چلتا چلتا دریا میں داخل ہو گیا تھا۔ بہت آگے جا کر کنارا اونچا ہونے لگا اور اونچا ہی ہوتا گیا۔ میں اس کی اوٹ میں بہت ہی تیز چل پڑا۔ ریت پاؤں پکڑتی تھی اور میں تھک بھی چکا تھا۔ ابھی میرے سامنے بہت فاصلہ تھا۔ میں نے اور تیز چلنے کی کوشش کی جس سے پنڈلیاں درد کرنے لگیں۔ رفتار کم کر لی۔ کنارہ اندر کی طرف آ رہا تھا۔ جیسے گھوم رہا ہو۔ میں اسے دریا کا موڑ سمجھ رہا تھا لیکن ہُوا یوں کہ میرے پاؤں ریت کی بجائے پانی میں پڑنے لگے اور پانی گہرا ہونے لگا۔ میں رک گیا۔ اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ دوسرا کنارہ مجھے اپنے قریب نظر آیا اور پانی کی آواز جو سنائی دے رہی تھی وہ بتا رہی تھی کہ پانی گہرا ہے......

"میں نے کنارے کے اوپر چلے جانے کا ارادہ کیا لیکن مجھے بتایا گیا تھا کہ دریا میں ہی جاؤں۔ محفوظ راستہ یہی تھا۔ کنارے کے باہر فوجی ہو سکتے تھے اور ضرور ہوں گے کیونکہ سرحد قریب تھی۔ میں پانی میں چل پڑا۔ فوراً ہی پانی میرے گھٹنوں تک آ گیا اور تین چار قدموں پر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں نے ڈبکی کھائی اور سنبھل گیا۔ پانی کا بہاؤ اُدھر ہی تھا جدھر میں جا رہا تھا۔ ذہن میں رکھئے کہ یہ جنوری فروری کی رات تھی۔ پانی برف کی طرح یخ تھا اور میری عمر پچاس سال سے تین سال اور سات ماہ اوپر تھی۔ میں ہاتھ پاؤں آہستہ آہستہ مارنے لگا تا کہ ڈوب نہ جاؤں۔ پانی مجھے اپنے زور پر آگے لے جا رہا تھا۔ یہاں سے دریا مڑتا تھا اور کنارے تنگ تھے۔ شاید نصف میل تک میں تیرتا رہا۔ پانی گہرا تھا۔ میں تے

پاؤں نیچے گئے اور ریت محسوس کی۔ تھوڑی دور اور آگے گیا تو بائیں طرف والا کنارہ پیچھے ہٹنے لگا۔ پانی پھیل رہا تھا۔ پاؤں پھر نیچے گئے تو تہ سے جا لگے۔ میں کھڑا ہو گیا اور پانی سے نکلنے لگا۔ پاٹ چوڑا ہو گیا تھا۔ میں ریت پہ چلنے لگا مگر اب چلنا ناممکن نظر آتا تھا۔ جسم اکڑ رہا تھا۔ کانوں اور کنپٹیوں میں اتنا شدید درد شروع ہو گیا جو میری برداشت سے باہر تھا۔ دانت بج رہے تھے۔ ہوا کے جھونکے بڑے ہی ظالم تھے۔ میرا بے ہوش ہو جانا لازمی تھا۔ کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا.....

"جسم گرم کرنے کا یہی ایک ذریعہ تھا کہ دَوڑوں۔ دوڑنے کی ہمت نہیں تھی مگر میں دوڑ پڑا۔ بازو زور زور سے ہلانے لگا۔ دوڑتے دوڑتے میں کنپٹیوں اور کانوں کو بھی رگڑ لیتا تھا۔ مجھے اب یوں نظر آ رہا تھا کہ گر پڑوں گا اور اکڑ کر مر جاؤں گا۔ ہندوستانی فوجیوں کا خطرہ الگ تھا۔ میری طاقت ختم ہو چکی تھی اور مجھ میں شاید اتنی طاقت بھی نہیں رہی تھی کہ اپنے آپ کو روک سکوں۔ مجھے ایسے بھی یاد آتا ہے جیسے میں دوڑتے دوڑتے بیہوش ہو گیا یا سو گیا تھا۔ بہرحال میری ٹانگیں آگے پیچھے ہوتی رہیں، پاؤں اٹھتے اور گرتے رہے۔ یہ ریت تھی جس پر آواز پیدا نہیں ہوتی تھی۔ پھر میرے پاؤں رکنے لگے۔ میں چلتا گیا، مگر جسمانی طاقت نہیں تھی۔ خطرے کی طاقت تھی اور میرے عزم کی طاقت تھی۔ میری حِسّیں شاید مُردہ ہو گئی تھیں۔ میں الفاظ میں بتا نہیں سکتا کہ میری اُس وقت ذہنی اور جسمانی حالت کیا تھی... آخر وہ مقام آ ہی گیا کہ ٹانگیں لکڑیاں بن گئیں۔ انتہائی کوشش کے باوجود چلنے سے معذور ہو گئیں۔ دماغ جام ہو گیا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ کتنا فاصلہ طے کیا ہے۔ میں نے آخری حرکت صرف یہ کی کہ کنارے کی طرف چلا گیا۔ کنارہ اونچا نہیں تھا۔ میں ریت سے نکلا اور پکی زمین پہ بیٹھ گیا۔ کپڑوں سے پانی نکل گیا تھا مگر یہ خشک نہیں ہوئے تھے۔ پھر میں سو گیا یا اکڑ گیا؟ میں بتا نہیں سکتا۔ میرے جسم میں مدافعت کی طاقت نہیں رہی تھی۔ ارادے اور جذبے بھی اکڑ چکے تھے۔ میرے

ذہن میں آخری جو خیال آیا وہ یہ تھا کہ میرا سفر ختم ہو چکا ہے اور میں منزل سے ابھی دُور ہوں۔ شاید میرے آنسو بھی نکلے تھے۔ پھر رات اور زیادہ گہری ہو گئی.....

"میرا دماغ بیدار ہو گیا۔ زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے اور میری آنکھیں کھلنے لگیں۔ تیز دھوپ نے آنکھیں کھلنے نہ دیں۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔ سورج اوپر آ گیا تھا۔ گھڑی دیکھی، دو بجے تھے، لیکن یہ دن کے دو نہیں ہو سکتے تھے۔ گھڑی رات دو بجے اندر پانی چلے جانے سے رک گئی تھی۔ کپڑے ٹھنڈے تھے۔ البتہ خشک ہو چکے تھے۔ میں کہاں تھا؟ ہندوستان میں یا پاکستان میں؟ کچھ خبر نہیں تھی۔ میں جلدی سے اٹھا اور دریا سے دور ہٹ گیا۔ آگے کھیت آ گئے۔ ایک ایسی چیز نظر آئی جس سے مجھے شک ہُوا کہ پاکستان ہے۔ ایک چھوٹی سی خانقاہ تھی۔ اس پر رنگ برنگے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ میں خانقاہ تک گیا۔ اس کے قریب بچے کھیل رہے تھے۔ ان سے پوچھا کہ یہ کس کی خانقاہ ہے؟ انہیں معلوم نہیں تھا۔ پھر میں نے پوچھا — 'لاہور کتنی دور ہے؟' — انہوں نے بتایا کہ وہ جو گاؤں ہے اس سے گزر کر آگے چلے جاؤ۔ آگے ایک پکا راستہ ملے گا اور وہ راستہ پکی سڑک تک چلا جائے گا۔ وہاں سے تانگے اور بسیں شہر جاتے ہیں۔ یکلخت میرے جسم کا خون رک گیا۔ سکون کی اچانک لہر نے مجھے سرد کر دیا۔ مسرّت کے دھچکے نے میرا دماغ چکرا دیا۔ میں منزل پہ پہنچ گیا تھا — ایک گھنٹے بعد میں فوجی افسروں کے درمیان بیٹھا تھا.....

مَیں نے انہیں اپنی زندگی کی ساری داستان سُنا ڈالی اور انہیں ہندوستان کے مسلمانوں کا پیغام دیا۔ انہیں مشرقی پاکستان کی خونچکاں باتیں سنائیں۔ وہ خاموش رہے۔ بعض کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ چونکہ فوجی افسر تھے اس لیے انہوں نے ڈسپلن کا خیال کرتے ہوئے کوئی رائے نہ دی.....

"انہوں نے مجھے گرم گرم چائے پلائی، میرے گیلے کپڑے تبدیل کیے اور انہی کی مدد سے میں کراچی پہنچا اور وہاں کے دو فوجی افسروں نے میری بہت مدد کی۔ پھر مجھے اپنے کنبے کی اطلاع مل گئی کہ بھارت کے ایک قیدی کیمپ میں ہے۔ میں نے انہیں خط لکھا۔ جواب آگیا اور آج میں اپنے کنبے کے درمیان بیٹھا یہ کہانی سنا رہا ہوں۔ میں نے یہ کہانی آپ کی تفریح کے لئے نہیں سنائی اور نہ ہی یہ کہانی اس لئے سنائی ہے کہ آپ مجھے ہیرو کہیں۔ میں تو کسی نہ کسی کے سہارے سے فرار ہوا تھا۔ مجھ جیسے کئی لوگ اللہ کے آسرے مشرقی پاکستان سے نکلے اور حیران کن دلیری اور دانشمندی سے پاکستان میں داخل ہوئے ہیں۔ آپ میری ساری کہانی بے بنیاد قرار دے دیں، لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کے اس پیغام کو نہ بھولیئے گا "ہم نے اپنی قسمت پاکستان کے ساتھ وابستہ کر رکھی ہے۔ پاکستان سر جھکاتا ہے تو ہندوستان میں ہمارے بھی سر جھک جاتے ہیں۔ ہم پاک فوج کی راہ دیکھ رہے ہیں"۔

وہ مر گیا ہے، تم زندہ رہو

راوی: عزیز احمد
تحریر: عنایت اللہ

دس سال گزرے، میں ایک روز علامہ اقبال روڈ پر میاں میر نہر کی طرف پیدل چلا جا رہا تھا۔ ایک کوٹھی کے سامنے بیاہ شادی کا منظر نظر آیا۔ فٹ پاتھ اور کوٹھی کے درمیان تین چار پائیوں پر بینڈ والے بیٹھے تھے۔ شاید بارات تیار ہو رہی تھی۔ سائیڈ ڈرم والے نے غالباً بوریت کم کرنے کے لیے ڈرم بجانے والی چھڑیوں سے ڈرم کو اس طرح بجانا شروع کر دیا کہ "غرر.... رر.... رر.... رر" کی طویل آواز بلند ہوئی جیسے کوئی ٹین کی چادر پر پانی کی تیز دھار مار رہا ہو۔ سائیڈ ڈرم کی آواز اسی طرح ہوتی ہے جو میرے لیے انوکھی نہیں تھی۔ البتہ ایک انوکھے منظر نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا جو بجلی کے کھمبے سے دو قدم دور کھڑا تھا۔

وہ چونکہ میرے راستے میں کھڑا تھا اس لیے میں نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ اُدھر سائیڈ ڈرم کی آواز سنائی دی اِدھر بوڑھے نے چونک کر اُدھر دیکھا۔ اُس کی آنکھیں کھلتی چلی گئیں۔ میں اُس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ کھڑے کھڑے ڈولنے لگا۔ اُس نے لپک کر بجلی کے کھمبے کو پکڑ لیا مگر سنبھل نہ سکا۔ اس کے ہاتھ نیچے کو سرک گئے اور گھٹنے زمین سے جا لگے۔

میں تیزی سے آگے بڑھا اور دو زانو بیٹھ کر بوڑھے کو سنبھال لیا۔ اُس نے میرے بازوؤں کا سہارا لے کر پیٹھ کھمبے سے لگا لی اور دانت پیس کر بولا۔

"خدا کے لیے اسے کہو سائیڈ ڈرم نہ بجائے۔ اس کے ہاتھ پکڑ لو۔ اسے روکو۔"

شادی والے گھروں کی منڈیروں پہ نصب کیے ہوئے چیختے چنگھاڑتے کانوں کے پردے پھاڑتے لاؤڈ سپیکروں اور بینڈ باجے کے غل غپاڑے کو کون روک سکتا ہے۔ مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ ویت نام میں مرے ہوئے کسی امریکی فوجی کی میلی کچیلی وردی پہنے ہوئے اس کالے کلوٹے مریل سے پاکستانی کو کہتا کہ تمہارے سائیڈ ڈرم کی آواز سے ایک بوڑھا بے ہوش ہو گیا ہے۔ خدا کے لیے ہاتھ روک لو، لیکن خدا نے کرم کیا کہ اُس کے ہاتھ رُک گئے جس کی غالباً وجہ یہ تھی کہ اُس کے ایک ساتھی نے سگریٹ سُلگایا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اُس سے لجاجت سے سگریٹ کا ایک کش مانگ رہا تھا۔

میں بوڑھے کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس کا سائیڈ ڈرم کی آواز پہ چکرا جانا میرے لیے معمہ تھا۔ جو آدمی ایک ڈرم کی آواز سے بے ہوش ہو جائے وہ پاکستانی نہیں ہو سکتا۔ ریڈیو اور لاؤڈ سپیکروں سے فلمی گانوں کا جگر خراش اور فلک شگاف غل غپاڑہ تو پاکستانی زندگی کا لازمی حصہ معلوم ہوتا ہے۔ اسے برداشت کرنے کے لیے خدا نے ہر پاکستانی کے اعصاب لوہے کے بنائے ہیں۔ وہ بوڑھا اردو بول رہا تھا لیکن کسی اور دیس کا معلوم ہوتا تھا جو اتنی سی آواز پر غش کھا کر گر پڑا تھا۔

قریب ہی گنڈیریوں والا بیٹھا تھا۔ اُس سے پانی مل گیا جو میں نے بوڑھے کو پلایا۔ وہ پانی پی کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہمارے گرد تماشائیوں کا ہجوم ہو گیا تھا۔ بوڑھا ہجوم کو چیرتا میاں میر نہر کی سمت چل پڑا۔ ہجوم نے مجھے نرغے میں لے کر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں بڑی ہی مشکل سے ہجوم سے نکلا اور بوڑھے کے پیچھے چل پڑا۔

وہ چہرے سے تو خاصا بوڑھا لگتا تھا لیکن اُس کا جسم جیسے میں نے سہارا

دیتے وقت محسوس کیا تھا، مضبوط تھا۔ اُسے چلتے ہوئے دیکھا تو وہ لاٹھی کی طرح سیدھا گردن تانے ہوئے چل رہا تھا۔ چال ڈھال سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ہاکی یا فٹ بال یا دوڑ کا کھلاڑی رہ چکا ہے۔ مجھے یہ شک بھی ہوا کہ اُس نے جوانی فوج میں گزاری ہے۔

مجھے اُسی طرف جانا تھا جدھر وہ چلا جا رہا تھا۔ میں نے اُسے جا لیا۔

"اگر آپ کمزوری محسوس کر رہے ہوں تو آپ کو ٹیکسی یا رکشا میں گھر پہنچا دوں گا۔" میں نے اُسے کہا۔

وہ رُک گیا اور کھسیانا سا ہو کے بولا "اوہ معاف کرنا! میں آپ کا شکریہ ادا کیے بغیر چلا آیا۔ آپ نے مجھے سنبھال لیا تھا۔۔۔۔ آپ کدھر جا رہے ہیں؟"

"نہر تک جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "ذرا گھومنے نکلا تھا۔"

"تو چلیے، اکٹھے چلتے ہیں۔" اُس نے کہا۔ "ٹیکسی کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو میلوں پیدل چلا کرتا ہوں۔ نہ چلوں تو جسم مُردہ ہو جاتا ہے۔۔۔۔ آپ کہیں ملازم ہیں؟"

میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ چلتے چلتے رُک گیا اور بچوں کی طرح اشتیاق آمیز لب و لہجے میں پوچھا۔ "پھر آپ کہانیاں بھی لکھتے ہوں گے؟" ــــ اُس کا اشتیاق فوراً ہی بجھ گیا، اور مایوس سے لہجے میں کہنے لگا ــــ "انگریزی رسالوں میں سچی کہانیاں چھپتی ہیں لیکن ہمارے ملک کے رسالے افسانے چھاپتے ہیں۔ صرف رومانی افسانے اور عشق و محبّت کی غزلیں۔"

میں نے اُسے بتایا کہ "حکایت" میں سچی کہانیاں شائع کی جاتی ہیں۔ پھر میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون ہے، کیا کرتا ہے اور کہاں رہتا ہے۔

"میں ایک کہانی ہوں" ــــ وہ ہنس پڑا اور ماتھے پر سوچ بچار کی شکنیں ڈال کر کہنے لگا ــــ "ایک مدت گزر گئی ہے جب یہ کہانی انڈیا میں ایک دوست کو سنائی تھی۔ آج آپ کو سناؤں گا۔۔۔۔ آپ کے پاس وقت ہے؟"

"کہانی سُننے کے لیے میں آپ کے ساتھ میل ہا میل پیدل چل سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "ساری رات جاگ سکتا ہوں کیونکہ یہ میرا پیشہ ہے۔ پہلے یہ بتایئے کہ آپ سائیڈ ڈرم کی آواز سن کر گر رہے تھے یا اس ذہنی حالت میں آپ کو یہ آواز اچھی نہیں لگی تھی؟ آپ نے کیوں کہا تھا کہ اسے روکو؟"

"میری کہانی اسی منحوس آواز سے شروع ہوتی ہے"۔ اُس نے انکشاف کیا۔ "پورا بینڈ بج رہا ہو، بیس ڈھول اور نقارے بج رہے ہوں، مجھ پر کچھ اثر نہیں ہوتا مگر اکیلا سائیڈ ڈرم جب اس طرح بجے جس طرح اس کمبخت نے بجایا تھا تو میرے سارے جسم کے اندر بچھو رینگنے لگتے ہیں اور میں پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکتا۔"

ہم نہر کے کنارے پہنچ چکے تھے۔ دائیں طرف گھوم کر ہم شاہراہِ قائدِ اعظم کی طرف چل پڑے۔ کوئی ایک فرلانگ آگے جا کر ہم نہر کے کنارے بیٹھ گئے۔

"آپ کو شاید یاد نہ ہو یا ہو سکتا ہے کہ آپ اُس وقت پیدا ہی نہ ہوئے ہوں"۔ اُس نے کہا۔ "ہندوستان میں ایک بہت بڑا سرکس ہُوا کرتا تھا جس کا نام رُکما بائی سرکس تھا۔ پاکستان میں تو کوئی سرکس کے نام سے بھی واقف نہیں"۔

مجھے یاد آ گیا۔ رُکما بائی سرکس مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ میں بہت چھوٹا سا تھا۔ اُس دور میں بڑے بڑے سرکس آیا کرتے تھے جن میں تین تو بہت ہی بڑے تھے۔ گرانڈ رشین سرکس، تارا بائی سرکس اور رُکما بائی سرکس۔ یہ برِّ صغیر پاک و ہند کے تمام شہروں میں جایا کرتے تھے۔ رُکما بائی بمبئی کی رہنے والی قوی ہیکل، دراز قد عورت تھی۔ مردوں کی طرح برجس اور کوٹ پہنا کرتی تھی۔ آج کل ایسے پہلوانی جسم جثّے کا کوئی مرد بھی نظر نہیں آتا۔ وہ شیروں اور چیتوں سے کرتب کرایا کرتی تھی۔

میں اُس وقت بچہ تھا۔ بہت سی باتیں بھول گیا ہوں لیکن رُکما بائی کو نہیں بھولا۔ وہ اب بھی مجھے درندوں کے اکھاڑے میں جس کے ارد گرد گول دائرے میں لمبی سلاخیں لگی ہوتی تھیں، ہنٹر گھماتی نظر آتی ہے۔ اس کے سرکس کا ایک

ببر شیر ایسے لگتا تھا جیسے سدھایا ہُوا نہ ہو بلکہ ابھی جنگل سے آیا ہو۔ جب یہ شیر پنجرے سے نکل کر اکھاڑے میں آتا اور رُکما بائی کے گرد دوڑتا ہوتا تو اکھاڑے کی سلاخوں کے باہر سرکس کے دو آدمی رائفلیں شیر کی طرف کیے رکھتے تھے۔ رُکما بائی کے ایک ہاتھ میں ہنٹر اور دوسرے میں ریوالور ہُوا کرتا تھا۔

رُکما بائی ہنٹر گھماتی اور شیر کو قابو کرنے کی کوشش کرتی تھی تو شیر غصے سے گرج گرج کر اُس کے ہاتھ سے ہنٹر چھیننے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ تماشائیوں پر سناٹا طاری ہو جاتا تھا۔ ہر لمحہ گماں ہوتا تھا کہ شیر اس عورت کو چیر پھاڑ دے گا۔

۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے جب میں نے رُکما بائی کا سرکس اپنے شہر میں دیکھا۔ ہمارے شہر سے یہ سرکس پشاور چلا گیا اور چند دنوں بعد اخباروں میں خبر چھپی کہ رُکما بائی کو اسی شیر نے اکھاڑے میں اس طرح مار ڈالا ہے کہ اُس کی ایک ٹانگ منہ میں پکڑ لی۔ دونوں رائفل برداروں نے بیک وقت گولیاں چلائیں۔ رُکما بائی نے بھی ریوالور سے اس پر فائر کیا مگر شیر تین گولیاں کھا کر اس وقت مرا جب وہ رُکما بائی کے جسم کو دو حصوں میں چیر چکا تھا۔

میں نے بوڑھے کو یہ واقعہ سنایا۔

"میں اسی سرکس میں ہُوا کرتا تھا۔ لیکن میں آپ کے شہر میں یا پشاور نہیں گیا"۔ اُس نے کہا۔ "مجھے بمبئی میں خبر ملی تھی کہ رُکما بائی کو شیر نے مار دیا ہے۔ میں بہت رویا تھا کیونکہ وہ دلیر عورت مجھے اپنی ماں سے زیادہ عزیز تھی اور وہ میرے ساتھ ماں کی طرح پیار کیا کرتی تھی۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی اس کے سرکس میں زمین سے ساٹھ فٹ اُوپر پینگوں کے کرتب کیا کرتے تھے۔ ہماری ماں بچپن میں ہی مر گئی تھی۔ ہمارا باپ اسی سرکس میں جانوروں اور درندوں کا انچارج تھا۔ میرا بھائی مجھ سے دو سال چھوٹا تھا۔ ماں مر گئی تو میرے باپ نے ہم دونوں بھائیوں کو اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ پھر سرکس ہی ہمارا گھر اور ہمارا وطن بن گیا جو ہندوستان کے شہروں اور قصبوں میں گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ ہم سرکس کے جانوروں خصوصاً ہاتھیوں کے ساتھ کھیلا کرتے اور سرکس دیکھا

کرتے تھے....

"میری عمر نو دس سال ہوئی تو رنگ کا بانی نے میرے باپ سے کہا "آپ کے دونوں بچے تندرست اور پھرتیلے ہیں۔ انہیں سرکس کے کسی کرتب کی ٹریننگ دلانی شروع کر دو۔ ان کا مستقبل سنور جائے گا!...

"میرے باپ کو یہ مشورہ پسند آگیا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے اشتیاق سے کہا کہ میں پینگ کے کرتب سیکھنا چاہتا ہوں۔ میرے چھوٹے بھائی کو بھی پینگ ہی پسند آئی۔ دُوسری ہی صبح سے سرکس کے انسٹرکٹر نے جو کارندوں کو مشق کرایا کرتا تھا، ہم دونوں بھائیوں کو ٹریننگ دینی شروع کر دی...

"دو سال میں ہم دونوں رنگ میں تماشا دکھانے کے قابل ہو گئے۔ اُس وقت میری عمر بارہ سال اور میرے بھائی کی دس سال تھی۔ ہمارا سرکس دِلّی میں تھا۔ پینگوں کے کرتب کرنے والا ایک جوان سال اینگلو انڈین اور اسی کی عمر کی ایک چینی لڑکی تھی۔ جب ہم دونوں بھائی اس فن کے ماہر ہو گئے تو سارے شہر میں اشتہاروں کے ذریعے اعلان کیا گیا کہ سرکس کی تاریخ میں پہلی بار دو معصوم بچے زمین سے ساٹھ فٹ اُوپر پینگوں کے خطرناک کرتب دکھائیں گے....

"اُس رات سرکس میں تماشائیوں کا ہجوم غیر معمولی تھا۔ یہ ہماری تشہیر کا اثر تھا۔ زمین سے ساٹھ فٹ اُوپر دو پینگیں آمنے سامنے لٹک رہی تھیں جن کے ڈنڈے لوہے کے تھے۔ دونوں کا درمیانی فاصلہ پندرہ گز تھا۔ نیچے زمین میں کھمبے گاڑ کر مضبوط رسّیوں کا جال بندھا ہوا تھا تاکہ اُوپر سے کوئی گر پڑے تو وہ جال میں گرے، ورنہ زمین پر گرنے سے ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔ پینگ کے کرتب ہمیشہ نیچے جال پھیلا کر کیے جاتے تھے۔ ذرا سی غلطی کرتب کرنے والے کو آسمان سے زمین پر لے آتی تھی....

"پینگوں کے کرتب تو بہت سارے تھے لیکن دو بہت ہی خطرناک تھے۔ ایک یہ کہ ہم دونوں بھائی اپنی اپنی پینگ کے ڈنڈے کو ہاتھوں میں پکڑ کر لٹک جاتے تھے اور ایک دوسرے کی طرف اُڑتے تھے۔ ایک سیکنڈ میں میرا بھائی میری پینگ پر اور میں اُس کی پینگ پر ہوتا تھا....

"دُوسرا کرتب اس سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ میں ڈنڈے کے ساتھ ٹانگیں دُہری کر کے اس طرح لٹک جاتا تھا کہ میرا سر نیچے ہوتا تھا۔ اُدھر میرا بھائی اپنی پینگ کے ڈنڈے کو ہاتھوں سے پکڑ کر لٹک جاتا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف ہلارا لیتے تھے۔ میرا بھائی ڈنڈا چھوڑ کر ہوا میں قلابازی لگاتا تھا اور میں بازو اُس کی طرف بڑھاتا تھا۔ وہ میرے ہاتھ پکڑ لیتا تھا اور میں اُس کے ہاتھوں کو مضبوط گرفت میں لے کر اُسے اپنے ساتھ لے آتا تھا....

"جب یہ کرتب شروع ہونے لگتا تھا تو رنگ ماسٹر رنگ میں آکر کرتب کا اعلان کرتا تھا۔ آرکسٹرا بالکل خاموش ہو جاتا تھا۔ صرف ایک سائیڈ ڈرم بالکل اسی طرح بجتا تھا جس طرح اس شادی کے بینڈ والے نے بجایا تھا۔ سرکس کے اندر سنّاٹا طاری ہو جاتا تھا کیونکہ تماشائی بھی جانتے تھے کہ یہ کرتب کس قدر خطرناک ہے۔ اس خاموشی میں جب سائیڈ ڈرم کی "غرر.... ررر.... ررر" کی آواز اُبھرتی تھی تو عجیب سنسنی سی طاری ہو جایا کرتی تھی۔ ڈرم کی یہ لَے سنسنی کا تاثر پیدا کرنے کے لیے ہی بجائی جاتی تھی۔ پھر ڈرم کی آواز فیڈ آؤٹ ہونے لگتی تھی اور ہم بھائی زمین سے ساٹھ فٹ اُوپر وہ کرتب دکھاتے تھے جس میں بال برابر غلطی یا ایک سانس جتنی دیر ہمیں موت کے منہ میں پھینک سکتی تھی لیکن ہماری حفاظت کے لیے نیچے جال تنا ہوتا تھا۔ گرنے کی صورت میں ہم بالکل محفوظ رہ سکتے تھے....

"ہم دونوں بھائیوں نے چار سال تک یہ کرتب ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں دکھائے۔ سرکس کے شائقین کو شاید اب بھی اَیزی اور جمی یاد ہوں گے۔ میرا نام عزیز احمد ہے اس لیے مجھے اَیزی کا نام دیا گیا تھا اور میرے چھوٹے بھائی کو جمیل احمد کی وجہ سے جمی کہا جاتا تھا....

"ہمارا سرکس کلکتے چلا گیا۔ اُس وقت میری عمر سولہ سال تھی اور میرا چھوٹا بھائی چودہ سال کا ہو گیا تھا۔ بہت پیارا اور بھولا بھالا بچہ تھا۔ ہم اپنے کرتبوں میں اس قدر ماہر ہو گئے تھے کہ آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی تو بھی ایک پینگ سے دوسری پینگ پر کود جاتے....

"کلکتے میں ایک روز رُکما بائی نے ہمیں کہا۔ اگر تمہارے نیچے سے جال ہٹا دیا جائے تو بھی کرتب کر سکو گے؟ ڈر تو نہیں جاؤ گے؟ تم دونوں ماسٹر ہو گئے ہو۔ اب گرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا....

"ہم دونوں نے خندہ پیشانی سے کہہ دیا کہ ہم جال کے بغیر کرتب دکھائیں گے۔ ہمارا باپ بھی رضامند ہو گیا۔ اُس زمانے میں سنیما بہت ہی کم تھے۔ فلم انڈسٹری کی ابتدا تھی۔ اُس زمانے میں کلکتہ آج کے کراچی جتنا بڑا شہر تھا۔ اتنے بڑے شہر میں شاید دو یا تین سنیما ہال تھے۔ لوگ سرکس کے دلدادہ تھے اس لیے وہ ہر ایک کرتب کے خطروں اور کمال کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ جال کے بغیر زمین سے ساٹھ فٹ اُوپر بندروں کی طرح ایک پینگ سے دوسری پینگ تک جانا اور ہوا میں قلابازی لگا کر اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑ لینا کس قدر خطرناک ہوتا ہے....

"رُکما بائی نے سارے شہر میں مشتہر کرا دیا کہ سرکس کی دنیا کے کمسن اور محبوب فنکار ایزی اور جمی جال کے بغیر پینگوں کے کرتب دکھائیں گے....

"اُس رات تماشائیوں کی بھیڑ کا یہ عالم تھا کہ کسی کلاس میں کوئی سیٹ خالی نہیں تھی۔ سرکس کے کارندوں کے خیموں اور کیبنوں سے بھی کرسیاں نکال کر تماشائیوں کو دے دی گئی تھیں۔ تھرڈ کلاس کے تماشائیوں کے لیے دریاں منگوا کر رنگ کے قریب بچھا دی گئیں۔ فسٹ کلاس کے کئی ایک تماشائیوں کو آرکسٹرا کے قریب بیٹھنا پڑا۔ سرکس شروع ہو گیا۔ تیسرا آئٹم ہمارا تھا۔ رنگ ماسٹر نے اعلان کیا کہ آج ایزی اور جمی جال کے بغیر کرتب دکھائیں گے....

"یکایک تمام پٹرومیکس لیمپوں کی رسیاں کھینچ کر لیمپ دُور دُور اُوپر اُٹھا دیئے گئے۔ ان کے درمیان دو پینگیں لٹکتی نظر آ رہی تھیں۔ ہمیں اتنی بلندی پر لے جانے کے لیے دو اور پینگیں زمین پر رکھی رہتی تھیں۔ ان کے ساتھ رسے بندھے ہوتے تھے جنہیں کارندے کھینچتے تو پینگیں ہمیں اُوپر لے جاتی تھیں۔ ہم اصلی پینگوں پر جا کھڑے ہوتے تھے....

"جب دس بارہ پٹرومیکس لیمپ اُوپر اُٹھے تو ہم دونوں بھائی دوڑتے ہوئے رنگ میں آ گئے۔ ہمارے ہونٹوں پر روزمرّہ والی مسکراہٹ تھی۔ تین چار ہزار تماشائیوں نے جب تالیاں بجائیں تو کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ ہم نے جھک کر تماشائیوں کو سلام کیا اور دوڑ کر اپنی اپنی پینگ تک پہنچے جو زمین سے صرف ایک فٹ اُوپر لٹک رہی تھیں۔ ہم رسے تھام کر ڈنڈوں پر کھڑے ہو گئے اور رسے کھینچے گئے۔ ہمارے ساتھ ہزاروں تماشائیوں کی آنکھیں اُوپر اُٹھنے لگیں اور یہ ہزاروں آنکھیں اُن پینگوں پر جم گئیں جن پر قلابازی کھا کر میرے بھولے بھالے بھائی کو زندگی کا آخری کرتب دکھانا تھا....

"ہم ساٹھ فٹ بلند اپنی اپنی پینگوں پر آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ میرے بھائی کے ہونٹوں پر ہر روز والی معصوم اور نڈر مسکراہٹ تھی۔ میں جواب میں مسکرایا اور میری نظریں نیچے چلی گئیں۔ آج پہلی بار ہمارے نیچے جال نہیں تھا۔ میں نے اپنے آپ میں ہلکا سا دھچکا محسوس کیا۔ لیکن میں سنبھل گیا۔ چار برسوں میں ہم ایک بار بھی نہیں گرے تھے۔ اب بھی گرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی ہم نے پہلے تین چار ہلکے پھلکے کرتب دکھائے۔ آرکسٹرا بجتا رہا۔ پھر رنگ ماسٹر نے رنگ میں آ کر اعلان کیا:

"اب جمی ہوا میں قلابازی لگا کر ایزی کے ہاتھ پکڑے گا اور ایزی اسے اپنی پینگ پر لے جائے گا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ نیچے جال نہیں ہے۔ ان میں جو گر پڑا، وہ زندہ نہیں رہے گا...."

"تماشائیوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔ آرکسٹرا خاموش ہو گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہزار ہا تماشائی بُت ہوں۔ اس خاموشی میں بار بار اُسی شیر کی گرج سنائی دیتی تھی جس نے تین سال بعد پتنادر میں رُکما بائی کو دو حصّوں میں چیر دیا تھا۔ رِنگ ماسٹر رِنگ سے نکل گیا....

"آرکسٹرا کا سائیڈ ڈرم دو غر... رر... رر... رر" کی آواز میں بجنے لگا۔ آواز بلند اور تیز ہوتی گئی۔ اس آواز کے مخصوص تاثر نے سناٹے کو ہیبت ناک بنا دیا۔ مَیں نے آخری بار جمی کو دیکھا اور مَیں نے پینگ کو زور سے ہلارا دیا پھر ڈنڈے پر بیٹھ کر اپنے جسم کو نیچے گرا دیا۔ ٹانگیں دُہری کیں اور ڈنڈا گھٹنوں کے نیچے مضبوطی سے پکڑا گیا۔ اب میں اُلٹا ٹنگ رہا تھا....

"اُدھر جمی نے اپنی پینگ کو ہلارا دیا اور جب ہم دونوں کی پینگیں مطلوبہ رفتار اور فاصلے تک ہلارے میں آگئیں تو مَیں نے سر اٹھا کر دیکھا کہ جمی پینگ کے رسّے چھوڑ کر قلابازی کے لیے آ رہا تھا....

"مجھے سائیڈ ڈرم کی آواز کے فیڈ آؤٹ ہونے کا انتظار کرنا تھا لیکن ڈرم کی آواز ابھی بلند تھی۔ شاید بجانے والے پر اپنے ہی ڈرم کی آواز سنسنی پیدا کر چکی تھی کہ وہ بھول گیا تھا کہ اُسے آواز فیڈ آؤٹ کرنی ہے۔ بہر حال ہمارے کرتب پر اس کا کوئی اثر نہ تھا....

"خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہوا اور یہ کس طرح ہوا کہ میری پینگ کا ہلارا بال برابر کم ہو گیا۔ اُدھر جمی اپنی پینگ سے کودنے والا تھا۔ مَیں نے چلّا کر کہا۔ —— "جمی مت آنا۔ مَیں تم تک نہیں پہنچ سکوں گا" —— مگر وہ آ چکا تھا میری آواز شاید سائیڈ ڈرم کی آواز میں دب کر جمی تک نہیں پہنچی تھی۔ مَیں نے سر آگے کر کے دیکھا، جمی قلابازی بھی لگا چکا تھا اور اس کے پیارے پیارے بچوں کے سے ہاتھ میری طرف بڑھ آئے تھے۔ میری پینگ اُس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مَیں نے بازو پورے کے پورے آگے کر دیئے۔ جمی کے ہاتھ

پکڑنے کے لیے اپنے ہاتھ کھول دیئے۔ میرے منہ سے چیخ کی طرح آواز نکلی۔ "جمی خدا حافظ"....

"میری پینگ صرف ایک بال پیچھے رہ گئی تھی۔ جمی کی انگلیاں میری انگلیوں سے لگیں۔ مَیں نے اُس کی انگلیوں کو پکڑ لینے کے لیے مٹھیاں بند کر لیں، مگر افسوس، میری مٹھیاں خالی تھیں۔ جمی پیٹ کے بل تیزی سے زمین کی طرف جا رہا تھا اور نیچے جال نہیں تھا....

"میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس اندھیرے میں مجھے زمین پر دھمک کی ایسی آواز سنائی دی جو مجھے قبر میں بھی سنائی دیتی رہے گی۔ اس آواز کے ساتھ ہی مجھے تماشائیوں کے ہجوم میں سے کئی ایک عورتوں کی چیخیں سنائی دیں، پھر افراتفری اور بھاگ دوڑ سنائی دی....

"مجھے بالکل یاد نہیں کہ مَیں پینگ سے کس طرح اُترا تھا۔ ایسے یاد آتا ہے جیسے مجھے بے ہوشی کے عالم میں نیچے اتارا گیا تھا۔ مَیں دوڑتا ہوا رِنگ سے نکلا۔ میرا معصوم اور بھولا بھالا بھائی جیسے بس مرا پڑا تھا۔ سرکس کا ڈاکٹر اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ رُکما بائی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ میرا باپ سر ہاتھوں میں تھامے پرے بیٹھا تھا....

"مَیں نے بھائی کے چہرے کو دیکھا اور میری چیخیں نکل گئیں۔ مَیں نے اُسے قتل کر ڈالا تھا۔ مَیں ہی اس کی موت کا ذمّہ دار تھا....

"مَیں کتنے دن دھاڑیں مار مار کر روتا رہا مجھے یاد نہیں"۔

لاہور میاں میر نہر کے کنارے بیٹھے ہوئے چھریرے جسم والا عزیز احمد جس کے چہرے پر جھرّیوں کا جال بچھا ہوا تھا مجھے لڑکپن کا المیہ سُنا رہا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ سڑک کی ایک بتّی بوڑھے عزیز کے آنسوؤں میں جھلملا رہی تھی۔ آنسو بہہ گئے اور بتّی کی چمک بجھ گئی۔ اُس نے ہتھیلیوں سے آنسو پونچھ ڈالے۔

"گزرے ہوئے وقت کے لمحے گزرتے ہوئے لمحوں کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہتے ہیں۔" اُس نے کہا۔ "میں نے اُس وقت کو بھول جانے کی بہت کوشش کی ہے مگر جمی کی آخری وقت کی مسکراہٹ اور اس کی انگلیوں کے آخری لمس کو میں بھول نہیں سکا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو ہی جاتی ہے جو مجھے لڑکپن میں واپس لے جاکر زمین سے ساٹھ فٹ اُوپر پینگ پر کھڑا کر دیتی ہے۔ آج اس بینڈ کے سائیڈ ڈرم نے مجھ پر وہی ظلم کیا ہے جس نے مجھے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔"

اُس نے لمبی آہ بھری اور کہانی آگے چلاتے ہوئے کہا ——"میں نے رنگ میں جانا چھوڑ دیا۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ میرا کوئی پارٹنر نہیں رہا تھا اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ رنگ کے قریب جاتے ہی مجھے اپنا معصوم بھائی نظر آنے لگتا تھا۔ دل پر ایسا ہول طاری ہوتا تھا کہ میں وہاں سے بھاگ جایا کرتا تھا....

"ایک مہینے کی بھاگ دوڑ کے بعد رُکما بائی نے میری عمر کا ایک چینی لڑکا تلاش کر لیا جو میرا پارٹنر بن سکتا تھا یعنی میرے بھائی کی جگہ لے سکتا تھا۔ میرے باپ نے اور رُکما بائی نے مجھے بہلا پھُسلا کر رنگ میں لوٹ آنے پر آمادہ کر لیا۔ ہم دونوں نے تھوڑے دن مشق کی اور جب ہم ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہو گئے تو ایک رات ہم رنگ میں گئے۔ ہمیں وہی کرتب دکھانا تھا جس میں میرے بھائی کی جان ضائع ہوئی تھی لیکن نیچے جال پھیلا کر۔ رُکما بائی نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ کوئی ایک لاکھ روپیہ کیوں نہ پیش کرے، جال نہیں ہٹایا جائے گا....

"جمی کی موت کے بعد میں پہلی بار پینگ پر گیا۔ میں نے اور چینی لڑکے نے عام کرتب دکھائے۔ پھر وہ خطرناک آئٹم آئی۔ رنگ ماسٹر نے حسبِ معمول اعلان کیا کہ اب فلاں کرتب دکھایا جائے گا۔ آرکسٹرا خاموش ہو گیا۔ میں اپنی پینگ پر اور میرے سامنے لِلی دبینی لڑکا اپنی پینگ پر کھڑا تھا۔ اُس کے ہونٹوں

پر جمی والی مسکراہٹ تھی۔ اُس کے چہرے پر جمی والی معصومیت تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ جمی نہیں تھا۔ اتنے میں سائیڈ ڈرم کی آواز اُبھری۔ تماشائیوں پر تو سنسنی کی کیفیت طاری ہوتی ہی ہو گی مگر ہوا یہ کہ میرا اپنا جسم کپکپانے لگا۔ ایسے محسوس ہونے لگا جیسے ڈرم بجانے والا چھڑیاں ڈرم پر نہیں، میری کھوپڑی پر مار رہا ہو۔ پھر بھی میں نے عادت کے مطابق پینگ کو ہلا دیا اور اُلٹا لٹک گیا....

"سائیڈ ڈرم کی آواز اور زیادہ بلند ہو گئی اور اس آواز سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے اُلٹا لٹکتے ہوئے دیکھا کہ جمی زمین کی طرف جا رہا ہے۔ لِلی اپنی پینگ کو ہلا رہا ہے چکا تھا۔ میں نے چیخ کر کہا "مت آنا لِلی"۔ لِلی خوش قسمت تھا کہ اُس نے میری آواز سُن لی اور رُک گیا۔ مجھے ابھی تک اپنا چھوٹا بھائی جمی نظر آ رہا تھا....

"میرے جسم سے پسینہ پھُوٹ آیا۔ میں پینگ پر سیدھا ہوا۔ سر چکرانے لگا اور رسّوں پر ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہونے لگی۔ میں پینگ پر بیٹھ گیا اور نیچے والوں کو چلّا کر کہا "مجھے نیچے اتار دو"....

"لِلی حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ دوسری پینگ اُوپر آئی تو میں اس کے ذریعے نیچے اُتر گیا اور رنگ سے بھاگ کر اپنے خیمے میں جا گرا۔ رُکما بائی، رنگ ماسٹر اور میرا باپ دوڑے آئے۔ میں فرش پر اوندھے منہ پڑا ہچکیاں لے لے کے رو رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کچھ بھی نہ پوچھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مجھے کیا ہوا ہے اور میں کیوں رو رہا ہوں....

"دوسرے دن میرے باپ اور رُکما بائی نے مجھے بہت سمجھایا بجھایا۔ پھر بھی نہ جانے مجھے اکسایا گیا کہ اور پینگ کے تصور سے ہی میرے جسم کے اندر کیڑے رینگنے لگتے اور مجھے جمی کی آخری مسکراہٹ یاد آ جاتی۔ باپ نے مجھے جانوروں کی دیکھ بھال کے لیے اپنے ساتھ مصروف کر لیا۔ مجھے جانوروں خصوصاً ہاتھیوں سے بہت پیار تھا....

"تھوڑے دنوں بعد رُکما بائی کو میری جگہ پتنگ کا ایک اور قلاباز مل گیا۔

جب یہ قلاباز بلی کے ساتھ پہلی رات کرتب کرنے لگا تو آرکسٹرا کا سائیڈ ڈرم مخصوص سنسنی خیز آواز میں بجنے لگا۔ میں سرکس کے بڑے خیمے کے باہر کھڑا تھا۔ جب ڈرم کی آواز میرے کانوں میں پڑی تو اس کے ساتھ ہی میرا جسم لرزنے لگا اور میں نے اپنے آپ کو اور جی کو آمنے سامنے پتنگوں پر کھڑے دیکھا۔ جی قلابازی لگا چکا تھا اور میں چلّا رہا تھا۔ 'مت آنا جی'.....

"میری حالت بگڑنے لگی۔ دل پر خوف چھا گیا۔ میں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور آنکھیں بند کر لیں.....

"دوسری رات بھی ایسے ہی ہوا۔ تیسری رات بھی ایسے ہی ہوا۔ میری عمر صرف سولہ سال تھی۔ دماغ پختہ نہیں تھا کہ اپنے جذبات اور احساسات پر قابو پا سکتا۔ میں اُس وقت کہیں بھاگ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اُس وقت گھوڑوں وغیرہ کو رِنگ کے لیے تیار رکھنا ہوتا تھا....

"جب چوتھی رات بھی سائیڈ ڈرم کی آواز پر میری ذہنی حالت وہی ہو گئی تو میں بھاگ کر اپنے خیمے میں گیا۔ وہاں کچھ پیسے میرے اپنے رکھے ہوئے تھے۔ باقی پیسے باپ کے اٹیچی کیس میں سے نکالے اور سرکس کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ گیا۔ میں باپ کے نام ایک خط لکھ کر اُس کے بستر پر رکھ آیا تھا جس میں لکھا تھا کہ میں جی کی موت کو فراموش کرنے کے لیے بہت دور جا رہا ہوں۔ میں اب سرکس کے قریب سے بھی نہیں گزر سکوں گا۔ میں آپ کے اٹیچی کیس سے پیسے نکال کر لے جا رہا ہوں۔ اسے چوری نہ سمجھنا۔ کہیں نوکری مل گئی تو پیسے بھیج دوں گا....

"مجھے معلوم ہے کہ باپ کی حالت کیا ہوئی ہو گی۔ اُس کا چھوٹا بیٹا رِنگ میں مر گیا تھا اور بڑا بیٹا رِنگ سے بھاگ کر اس کے لیے جیتے جی مر گیا۔ انہی دو بیٹوں کی خاطر اُس نے دوسری شادی نہیں کی تھی....

"میں کلکتے سے ناگپور چلا گیا۔ کئی دفتروں میں نوکری کی تلاش کی لیکن میرے پاس کسی سکول یا کالج کا سرٹیفکیٹ نہیں تھا۔ میں صرف لکھ پڑھ سکتا تھا۔ سرکس میں اینگلو انڈین، مدراسی اور چینی کارندے تھے، جو انگریزی بولا کرتے تھے۔ میں نے بھی ان سے انگریزی بول چال سیکھ لی تھی۔ جیب میں پیسے تھے جو میں کفایت شعاری سے خرچ کرتا رہا۔ جب نوکری ملنے کی کوئی اُمید نہ رہی تو میں بمبئی چلا گیا۔ اس شہر سے میں واقف تھا۔ اتنے بڑے شہر میں کہیں نہ کہیں نوکری ملنے کی اُمید تھی مگر وہاں بھی اُمیدیں خاک میں ملتی نظر آئیں....

"ایک روز ایک ہوٹل میں کھانا کھاتے وقت، ایک بیرے سے بات کی تو اس نے ہوٹل کے مالک سے کہہ کر مجھے بیرا رکھوا دیا۔ مالک کو میری صرف یہ خوبی پسند آ گئی تھی کہ میں انگریزی بول سکتا تھا....

"میں نے وہاں صرف تین مہینے نوکری کی۔ میں سرکس کا شہزادہ تھا۔ سرکس کے ماحول میں بڑا پلا تھا۔ جب میں رِنگ میں جاتا تھا تو ہزارہا تماشائی تالیوں سے آسمان ہلا ڈالتے تھے، اور کہاں یہ ہوٹل کہ میں ہر طرح کے گاہک کے آگے کھانا رکھتا اور جھوٹے برتن اُٹھاتا تھا۔ میرے اندر کوئی ایسی قوت تھی جو مجھے سرکس کی طرف دھکیل رہی تھی۔ مجھے سرکس کے جانور یاد آتے تھے اور وہ فضا جس میں میں پیدا ہوا اور جوان ہوا تھا، میری رُوح میں رچ بس گئی تھی لیکن رُکما بائی کی سرکس جب یاد آتی تو جی بھی یاد آ جاتا تھا۔ سرکس کی محبت پر موت کا آسیب مجھے واپس نہیں جانے دے رہا تھا....

"ایک روز ہوٹل کے سامنے سے دو ہاتھی گزر گئے۔ اِن کے ساتھ بینڈ بجتا جا رہا تھا اور ایک آدمی اعلان کر رہا تھا کہ گرینڈ امپیریل سرکس آج رات پہلا شو دکھا رہا ہے جس میں فلاں فلاں کرتب دکھائے جائیں گے۔ سرکسوں کی تشہیر کا یہی طریقہ ہوا کرتا تھا کہ ہاتھیوں کو بینڈ کے ساتھ شہر میں گھمایا جاتا تھا اور ایک آدمی اعلان کیا کرتا تھا....

"میں نے جب اعلان سنا اور ہاتھی دیکھے تو میں بے تابو ہوگیا اور ہوٹل والوں کو بتائے بغیر اُس میدان میں پہنچا جہاں گرینڈ امپیریل سرکس نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ہمارا سرکس اسی میدان میں رہ کر گیا تھا۔ میں منیجر سے ملا۔ اُسے یہ نہ بتایا کہ میں سرکس کی آغوش میں پلا ہوا قلا باز ہوں۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں سرکس کے جانوروں خصوصاً ہاتھیوں کی دیکھ بھال کر سکتا ہوں اور انہیں رِنگ تک لے جا سکتا ہوں اور وہاں سے سلیقے سے نکال کر واپسی کے لیے گائیڈ کر سکتا ہوں....

"وہ ڈیسوزا نام کا ایک اینگلو انڈین تھا۔ اُس نے مجھے کسی حیل و حجت کے بغیر اتنی تنخواہ پر رکھ لیا جو اس کام کے لیے خاصی زیادہ تھی۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی۔ ڈیسوزا حیران کُن پیار سے پیش آیا، اور میں نے اُسی روز سے کام شروع کر دیا یعنی جانوروں کی دیکھ بھال....

"جانوروں کی دُنیا میں داخل ہوتے ہی مجھے سکون محسوس ہونے لگا۔ مجھے تنخواہ کی اتنی خوشی نہیں تھی جتنی اپنے ماحول میں واپس آجانے کی تھی۔ اس سرکس میں دو چیزوں کی کمی تھی۔ ایک یہ کہ یہ سرکس رُکما بائی کا نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ وہاں میرا باپ نہیں تھا....

"میں نے پہلی رات رِنگ کے قریب کھڑے ہو کر سرکس دیکھا۔ میں نے ابھی تمام فنکار اور قلا باز نہیں دیکھے تھے۔ ان سب کو رِنگ میں دیکھا۔ مجھے زیادہ دلچسپی پینگوں کے فن کاروں سے تھی۔ وہ جب رِنگ میں آئے تو میں ایک بہت ہی خوبصورت جوڑے کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں چینی تھے۔ ایک لڑکی جو رانی کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ ایک لڑکا جسے اینگل کہا جاتا تھا۔ لڑکی چینی ماں اور پنجابی باپ کی بیٹی تھی۔ چین اور پنجاب کے خدوخال نے مل کر اس لڑکی کو ایسا چہرہ اور ایسا جسم دیا تھا جسے دیکھتے ہی رہنے کو جی چاہتا تھا۔ چہرے کا رنگ نہ چینیوں کی طرح زردی مائل سفید تھا، نہ پنجابیوں کی طرح سانولا

یا گندمی۔ دونوں رنگ گھُل مل کر قدرت کے حسن کا جادو بن گئے تھے۔ اس کا پارٹنر، اینگل بھی چینی تھا۔ اُس میں بھی بلا کا حُسن تھا لیکن یہ حُسن زنانہ سا تھا۔ دونوں نہایت اچھی اُردو اور انگریزی بولتے تھے....

"میں نے پینگوں پر دونوں کے کرتب دیکھے مگر مجھے ان میں استادی کی جھلک نظر نہ آئی۔ وہ بہار دہ خطرناک کرتب بھی کرتے تھے جس میں لڑکی قلا بازی لگاتی تھی اور لڑکا اُسے میری طرح پینگ سے اُلٹا لٹک کر پکڑ لیتا تھا۔ نیچے جال ہوتا تھا۔ اس کرتب سے پہلے سائیڈ ڈرم بجتا تھا....

"میں نے پہلی بار ان کا کرتب دیکھا تو سائیڈ ڈرم بجا لیکن میں رانی کے حُسن میں ایسا جذب ہو گیا تھا کہ ڈرم کی آواز میرے اعصاب پر وہ اثر پیدا نہ کر سکی جو اپنے سرکس میں پیدا ہوا کرتی تھی....

"جب وہ پینگوں سے اُترے تو مجھے اپنے قریب سے منیجر ڈیسوزا کی آواز سنائی دی: "کیوں مسٹر! کیسا رہا؟ اچھا تھا؟...."

"مجھ سے ڈیسوزا نے کیوں پوچھا تھا؟ میں سمجھ نہ سکا۔ میں تو اس کا ادنیٰ ملازم تھا۔ وہ پرے چلا گیا اور میں رِنگ کے پیچھے سے باہر آگیا۔ میں اپنے گھوڑوں کے قریب پہنچا تو ایک عورت کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے دیکھا۔ وہ رانی تھی جو میرے قریب آن کھڑی ہوئی تھی۔ اُس نے بھی مجھ سے پوچھا: "تم ہمیں دیکھ رہے تھے، ہمارا کھیل کیسا تھا؟" ۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے ایسی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا جیسے ہم اکٹھے کھیل کر جوان ہوئے ہوں۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور قریب پڑے ہوئے سٹول پر بیٹھ گئی۔ اس نے سرکس والا تنگ اور چُست لمبا انڈر ویئر اور ویسا ہی بلاؤز پہن رکھا تھا جس سے اُس کے جسم کا ایک ایک خط نمایاں ہو رہا تھا۔ اس کے کھلے ہوئے ریشمی بال مجھے اور زیادہ پریشان کر رہے تھے۔ وہ میری ہم عمر تھی یعنی سترہ اٹھارہ سال کی عمر کی....

"میں نے اُسے بھی وہی جواب دیا جو ڈیسوزا کو دیا تھا لیکن یہ لڑکی میرے ساتھ ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہوتی جا رہی تھی۔ اتنے میں اُس کا پارٹنر ایگل آگیا۔ میرے ساتھ ہاتھ ملا کر اس نے بازو رانی کی کمر کے گرد لپیٹا اور اپنا گال اس کے بالوں پر رگڑ کر کہنے لگا ——— 'چلو رانی۔ مجھے نیند آ رہی ہے'....

"رانی اُٹھی اور مسکرا کر مجھے الوداع کہا پھر اُس نے ایگل کی کمر کے گرد بازو لپیٹ لیا اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہوئے اپنے خیمے میں چلے گئے۔ مجھ میں رقابت کا جذبہ بیدار ہو گیا اور ایگل مجھے اپنا دشمن نظر آنے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے....

"دوسرے دن رانی پھر میرے پاس آگئی اور بے تکلفی کے مظاہرے کرنے لگی۔ پھر میں نے اُسے ایگل کے ساتھ اس سے زیادہ بے تکلفی کے مظاہرے کرتے دیکھا۔ میں نے تجربہ کیا ہے کہ درمیان میں رقیب آجائے تو محبت شدید ہو جاتی ہے۔ ایگل کو درمیان میں دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے رانی کو میں دیوانہ وار چاہتا ہوں۔ ایگل سے مجھے نفرت سی ہونے لگی....

"چوتھی رات کا ذکر ہے کہ میں رِنگ کے قریب کھڑا رانی اور ایگل کا کھیل دیکھ رہا تھا۔ ڈیسوزا میرے قریب آ کھڑا ہوا۔ اس نے سنجیدہ سے لہجے میں پوچھا۔ 'تمہیں ان کے کھیل میں کوئی نقص نظر آتا ہے؟' ——— میں نے جواب دیا ——— 'میں جانوروں کی دیکھ بھال کے سوا کچھ نہیں جانتا'....

"اُس نے میرا بازو پکڑ لیا اور باہر لے گیا۔ باہر جا کر کہنے لگا ——— 'میرے ساتھ آؤ' ——— اور وہ مجھے اپنے خیمے میں لے گیا۔ اُس نے دو گلاس اور وسکی کی بوتل نکالی۔ دونوں گلاسوں میں تھوڑی تھوڑی وسکی ڈال کر سوڈا ملایا اور ایک گلاس میری طرف بڑھا کر کہنے لگا۔ 'دیکھو مسٹر! میں جانتا ہوں تم رُکما بائی کے سرکس کے مشہور فنکار ایزی ہو۔ تمہارا چھوٹا بھائی جمی رِنگ میں مرگیا ہے اور تم اس صدمے سے گھبرا کر رِنگ سے بھاگے بھاگے پھر رہے ہو۔ اگر اُس

سرکس میں تمہارا باپ نہ ہوتا تو میں تم دونوں بھائیوں کو منہ مانگے پیسے پیش کر کے تمہیں اپنے سرکس میں لے آتا۔ مجھے معلوم تھا کہ تمہارا باپ تمہیں نہیں آنے دے گا۔ میں نے تمہیں بمبئی میں پینگ پر دیکھا تھا۔ دِلّی میں بھی دیکھا ہے اور کلکتے میں بھی دیکھا ہے۔ تمہیں خدا نے میرے پاس بھیج دیا ہے۔ میں نے اسی لیے تمہیں فوراً ملازمت دے دی تھی تاکہ تم سرکس کے ماحول میں واپس آجاؤ۔ دیکھو ایزی! آسمان سے مت گرو۔ زمین پر تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ تمہارا مقام رِنگ کی بلندی پر ہے جہاں دو پینگیں ٹنگ رہی ہیں۔ تم رِنگ میں پیدا ہوئے ہو، تمہیں رِنگ میں ہی مرنا ہے۔ کل سے تم ایگل اور رانی کو مشق کرایا کرو گے پھر تم بھی رِنگ میں آؤ گے۔ میں جانتا ہوں تمہیں رُکما بائی کتنے پیسے دیتی تھی۔ میں اس سے ڈیڑھ گنا تنخواہ دوں گا۔ وسکی مفت ملے گی۔ اگر تم اس سے زیادہ اُجرت مانگتے ہو تو بتا دو۔ اور سنو ایزی۔ اس نے شفقت سے کہا ——— 'جمی کو بھول جاؤ۔ اُس کے مرنے کا مجھے بھی دُکھ ہوا تھا۔ وہ رِنگ کا شہزادہ تھا۔ مگر مر گیا ہے، تم زندہ رہو'....

"میرے آنسو نکل آئے اور میں کوئی بھی جواب نہ دے سکا۔ میں نے وسکی کا گھونٹ حلق میں انڈیلا اور آنسو پونچھتا ہوا ڈیسوزا کے خیمے سے باہر نکل آیا۔ میں اُس رات بہت بے چین رہا۔ کوئی فیصلہ نہ کر سکا لیکن صبح کے وقت میرے قدم اپنے آپ ہی مجھے رِنگ کے بڑے خیمے کے اندر لے گئے۔ تمام فنکار اپنے اپنے کھیل کی مشق کر رہے تھے۔ میں نے ایگل اور رانی کو بھی دیکھا....

"رانی نے مجھے دیکھا تو تیزی سے دوڑتی آئی اور میرے ساتھ لپٹ گئی۔ میں بوکھلا گیا۔ اُس کا جسم خوشبو کا جھونکا تھا جس نے مجھے مسحور کر دیا۔ اُس نے بچوں کے سے اشتیاق سے کہا۔ 'مسٹر ڈیسوزا نے رات کو بتایا تھا کہ تم رِنگ میں آ رہے ہو۔ اُس نے مجھے پہلے روز ہی بتا دیا تھا کہ تمہارے پاس پینگوں

کا ایک ایسا فنکار آگیا ہے جو ہوا میں قلابازی لگا کر پینگ پر واپس چلا جاتا ہے
اُس نے ہمیں کہا تھا کہ ایزی کو نہ بتانا کہ تم اس کے متعلق سب کچھ جانتی ہو۔
آج صبح اس نے بتایا ہے کہ تم ہمارے ساتھ شامل ہو رہے ہو۔'....

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں اس قدر شہرت یافتہ ہو گیا ہوں۔ رانی کی محبت اور ڈیلیسوزا کی باتیں مجھے رِنگ میں واپس لے گئیں۔ میں نے ایگل اور رانی کو ان کی خامیاں بتائیں اور انہیں پریکٹس کرانی شروع کر دی لیکن رِنگ میں کرتب دکھانے پر طبیعت آمادہ نہ ہوئی....

"اس دوران رانی میرے ساتھ اور زیادہ بے تکلف ہو گئی، یہاں تک کہ رات کو جب وہ اپنا کھیل ختم کر کے باہر نکلتی تو ہم دونوں الگ تھلگ جا بیٹھتے اور بچوں کی طرح باتیں کرتے رہتے۔ تقریباً ہر روز یوں ہوتا کہ ایگل آجاتا اور رانی کو بازو کے گھیرے میں لے کر اپنے ساتھ لے جاتا۔ میرا خون کھول اٹھتا لیکن میں نے دیکھا کہ ایگل میرے ساتھ پورے احترام اور پیار سے باتیں کرتا تھا۔ البتہ میرے دل میں اُس کے خلاف نفرت گہری ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے کئی بار رانی سے کہنے کی کوشش کی کہ وہ ایگل کے ساتھ اتنی زیادہ بے تکلفی نہ رکھے۔ اس سے میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے، لیکن مجھے ایسی بات کہنے کی جرأت نہ ہوئی....

"تھوڑے دنوں بعد رانی نے مجھے رِنگ میں کرتب دکھانے پر آمادہ کر لیا۔

ڈیلیسوزا تو ہر روز ہی کہتا تھا لیکن میں نے ہاں نہیں کہی تھی۔ رانی کی خواہش کو میں ٹھکرا نہ سکا۔ میں نے ایک روز رانی کے ساتھ اس کرتب کی مشق کی کہ وہ اپنی پینگ سے قلابازی لگا کر آئے اور میں اُس کے ہاتھ پکڑ کر اپنی پینگ پر لے آؤں۔ وہ یہ کرتب کر سکتی تھی۔ ہم نے اکٹھے مشق کر لی....

"ایک رات ہم دونوں رِنگ میں گئے۔ ہم عام سے کرتب دکھا چکے تو رِنگ ماسٹر نے اس خطرناک کرتب کا اعلان کیا۔ میرا تعارف بھی کرایا۔ وہی

مانوس سناٹا طاری ہو گیا۔ رانی میرے سامنے والی پینگ پر کھڑی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر جمی والی مسکراہٹ تھی۔ میں اُس کے سامنے اپنی پینگ پر کھڑا تھا۔ مجھے اس تصور سے ہی سرور محسوس ہونے لگا کہ میں ایک پھول جیسی لڑکی کو ہوا سے اُٹھا کر اپنے ساتھ لگا لوں گا....

"اچانک سائیڈ ڈرم کی غرر.... رر.... رر، اُبھری۔ میں اپنی پینگ سے اُلٹا لٹک گیا۔ پینگ کے ڈنڈے کو ٹانگوں سے جکڑ لیا۔ میں نے ہلارا لیا۔ اُدھر سے رانی نے ہلارا لیا اور سائیڈ ڈرم کی آواز عروج پر پہنچ گئی۔ یکایک یہ خیال تیر کی طرح دماغ میں پیوست ہو گیا کہ آج جمی کی جگہ رانی ہے اور مجھے رانی کے ساتھ اتنی ہی محبت ہے جتنی جمی سے تھی۔ مجھے جمی نظر آیا۔ وہ زمین کی طرف جا رہا تھا۔ میرے چہرے سے پسینے کی بارش برس گئی۔ دل ڈوب گیا۔ حالانکہ نیچے جال پھیلا ہوا تھا۔ رانی کے گر کر مرنے کا کوئی امکان نہ تھا مگر میں اپنے قابو سے نکل گیا اور میں نے چلّا کر کہا — 'رانی مت آنا' — اور میں پینگ پر سیدھا ہو گیا۔ مجھے ہر سُو جمی نظر آنے لگا۔ مجھ پر وحشت سی طاری ہو گئی اور مجھے نیچے اتار لیا گیا....

"میں اُٹھا تو دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ تماشائیوں نے خوب ہوٹنگ کی لیکن میں اس شور و غل سے بے نیاز بھاگتا ہوا اپنے خیمے میں جا گرا۔ میرا خیال تھا کہ ڈیلیسوزا آئے گا اور مجھے پکڑ دے گا یا ڈانٹ پلائے گا لیکن اس کی جگہ رانی کی نازک باہوں نے میرے گرد لپٹ کر مجھے سنبھال لیا۔ اس کے جسم کے لمس میں مجھے جمی کے لمس کا قرار آنے لگا۔ رانی کو معلوم تھا کہ میں سینے میں کیا روگ اٹھائے پھرتا ہوں....

"اُس نے مجھے اپنے والہانہ پیار سے ایسا سنبھالا دیا کہ میں اپنے آپ میں آگیا۔ اتنے میں ایگل بھی آگیا۔ وہ بھی میرے ساتھ لپٹ گیا اور کہنے لگا۔ 'ایزی! میں جانتا ہوں تمہاری یہ حالت کیوں ہوئی ہے۔ مجھے جمی سمجھو۔ اپنے دل میں جمی کی جگہ مجھے بٹھا لو۔ میں تمہارا چھوٹا بھائی ہوں۔ میرے بھائی رِنگ

سے نہ بھاگو۔ مرد بنو"....

"پھر ڈیسوزا آ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا جس میں وسکی تھی۔ اُس نے گلاس میرے ہاتھ میں دے کر کہا — "تم جوان آدمی ہو ایزی! ہوش میں آؤ" — اور وہ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ مَیں نے اُسے فیصلہ کہہ دیا کہ مَیں اب کبھی بھی پینگ پر نہیں جا سکوں گا۔ چاہو تو مجھے اپنے سرکس سے نکال دو....

"ڈیسوزا نے جواب دیا" تم اسی سرکس کے ساتھ رہو گے۔ پینگ پر جاؤ یا نہ جاؤ۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک روز میں تمہیں پینگ پر جانے سے روکوں گا تو تم اُوپر جانے کی ضد کرو گے۔ تم اپنی فطرت کو نہیں بدل سکتے۔ تم زمین پر نہیں ٹھہر سکو گے۔ وہ دن جلدی آئے گا جب تم اپنے آپ اُوپر چلے جاؤ گے"....

"اُس نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ دن ایک ہی ہفتے بعد آ گیا۔ اُس دن میرا موڈ سخت خراب ہو گیا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ دن کے وقت مَیں رانی کے خیمے کے سامنے سے گذرا۔ وہ بہت خوبصورت چوکور خیمے تھے۔ سامنے والا پردہ ذرا سا ہٹا ہوا تھا۔ مَیں نے دیکھا کہ اینگل اور رانی ایک ہی پلنگ پر لیٹے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ غصّے نے مجھے پاگل کر دیا اور مَیں نے اینگل کو قتل کر دینے کی سکیم تیار کر لی۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا، یہی کچھ سوچتا۔ مَیں جلتا بُھنتا اپنے خیمے میں چلا گیا....

"شام سے ذرا پہلے رانی میرے خیمے میں آ گئی۔ دِل میں جہاں محبت نے جوش مارا وہاں غصّے کا طوفان بھی اُمڈ آیا۔ ان دو طوفانوں نے میری زبان بند کر دی اور مَیں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اُس نے روزمرّہ کی طرح بے تکلفی اور ہنسی مذاق کی باتیں کیں اور چلی گئی۔ جاتے جاتے اس نے کہا۔ "آج اینگل پہلی بار اکیلا کھیل دکھائے گا اور آج پہلی بار نیچے جال نہیں ہو گا"....

"اس خبر سے مجھے خوشی سی ہوئی۔ دل سے دُعا نکلی کہ خدا اینگل کو گرا دے میں

قتل کے گناہ سے بچ جاؤں گا، مگر یہ خیال بھی آیا کہ ڈیسوزا سے کہوں کہ نیچے سے جال نہ ہٹائے۔ بال برابر غلطی نے جمی کو مار ڈالا تھا۔ کہیں اینگل بھی رِنگ میں جان نہ دے دے، لیکن مَیں نے کچھ بھی نہ کہا....

"رات کے وقت مَیں رِنگ کے قریب کھڑا اینگل کو اُوپر جاتا دیکھ رہا تھا۔ رانی میرے پاس کھڑی تھی۔ رِنگ ماسٹر نے اعلان کیا کہ آج چین کا نامی گرامی فنکار اینگل جال کے بغیر کرتب دکھائے گا....

"اینگل اپنی پینگ پر جا کھڑا ہوا اور کرتب دکھانے لگا۔ ہم دیکھ رہے تھے۔ آرکسٹرا نہایت اچھی اور موزوں دُھن بجا رہا تھا۔ اینگل نے ایک اور کرتب کے لیے پینگ کا ڈنڈا ہاتھوں میں پکڑ لیا اور نیچے لٹک گیا۔ اُس نے جسم کو ہلارا دیا تو پینگ ہلارے میں آ گئی۔ اچانک ایک طرف سے پینگ کا رسّہ ٹوٹ گیا اور ڈنڈا نیچے کو یعنی عمودی لٹکنے لگا۔ اینگل نے ڈنڈے کو مضبوطی سے پکڑ لیا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ پھسل رہے تھے۔ ڈنڈا لوہے کا تھا جس پر نِکل پالش کیا ہوا تھا۔ اس سے ہاتھوں کی گرفت پھسل جاتی تھی۔ ڈنڈا نیچے کو لٹک رہا تھا۔ مَیں ہی جانتا ہوں کہ کرتب کرتے وقت ہاتھوں سے کتنا پسینہ نکلتا ہے۔ پالش کیے ہوئے ڈنڈے پر پسینے والے ہاتھوں کی گرفت مضبوط رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ اینگل کا گرنا اور مرنا لازمی تھا۔ اُسے اب کوئی طاقت بچا نہیں سکتی تھی....

"جونہی رسّہ ٹوٹا، مجھے کارندوں کے شور میں رانی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ایزی! خدا کے لیے اسے بچاؤ" کارندے جال لانے کے لیے دوڑے۔ مجھے معلوم تھا کہ جال آنے تک، اور پھیلانے میں جتنا وقت لگے گا اتنے وقت میں اینگل کے ہاتھ پھسل کر اُسے مرنے کے لیے گرا چکے ہوں گے۔ مَیں نے اُوپر دیکھا۔ اینگل کے ہاتھ پھسل کر نیچے آ گئے تھے۔ تماشائیوں نے الگ شور بپا کر رکھا تھا۔ رانی نے چیخ ماری اور مجھے دھکّا دے کر کہا۔ "ایزی، کچھ کرو"....

"میں دَوڑ کر اُس پینگ تک گیا جو زمین سے ایک فٹ اُوپر لٹک رہی تھی۔

اس سے فنکاروں کو اُوپر نیچے کیا جاتا تھا۔ مَیں نے اس پینگ پر پاؤں رکھے۔ معلوم نہیں کس طرح اور کیوں میری نگاہ اس کے رسے پر پڑی۔ مجھے شک ہوا کہ ایک جگہ سے رسّہ کمزور ہے اور بوسیدہ ہو گیا ہے۔ مَیں اسی پینگ سے اُوپر جا سکتا تھا لیکن یہ رسّہ راستے میں ٹوٹ سکتا تھا۔ مَیں نے اسے چھوڑ دیا اور اُوپر ایگل کی طرف دیکھ کر چلّا کر کہا ـ 'ایگل گرفت مضبوط رکھنا۔ اُوپر اُٹھنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ ہاتھ پھسل جائیں گے۔ مَیں آ رہا ہوں' ....

" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں جواب دیا 'ایزی، جلدی آؤ، ہاتھ پھسل رہے ہیں' ....

" زندگی اور موت میں دو چار لمحوں کا وقفہ رہ گیا تھا۔ جال ابھی نہیں آیا تھا۔ مَیں دوسری پینگ کی طرف دوڑا۔ اتفاق سے وہ بھی زمین پر تھی۔ جلدی سے رسّہ دیکھا۔ ٹھیک تھا۔ مَیں نے کارندوں سے کہا ـــ 'کھینچو' ....

" دو آدمی قریب کھڑے تھے۔ انہوں نے رسّہ کھینچا اور مَیں اُوپر اُٹھنے لگا۔ مَیں دوسری پینگ تک پہنچ گیا۔ ایگل مجھ سے پندرہ گز دُور پینگ کے لٹکتے ڈنڈے سے لٹک رہا تھا۔ اب یہی ایک طریقہ رہ گیا تھا کہ مَیں پینگ کے ڈنڈے کو ٹانگوں سے پکڑ کر ایگل کی طرف ہلارا لوں اور اس کا ہاتھ پکڑ لوں مگر یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ ایگل جب تک ہلارا لے کر میری طرف نہ آتا میں اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ اُس کے لیے ناممکن تھا۔ اگر وہ ذرا سا ہلتا تو اس کے ہاتھ ڈنڈے سے پھسل جاتے۔ اس کا ڈنڈا صرف ایک رسّے سے لٹک رہا تھا....

"میں نے اللہ کا نام لیا اور پینگ سے الٹا لٹک کر ہلارا لیا۔ ایگل زور سے چلّایا ـــ 'ایزی جلدی، مَیں جا رہا ہوں' ـــ میرے لیے دوسری مشکل یہ تھی کہ مَیں نے پینگ کے کرتب والا چُست لباس نہیں بلکہ پتلون پہن رکھی تھی جو ڈنڈے پر ٹانگوں کی گرفت کو مضبوط نہیں ہونے دے رہی تھی۔ پھر بھی مَیں نے ہلارا لمبا کیا اور جب میں پورے ہلارے میں آگیا تو دیکھا کہ ایگل

مجھ سے کوئی ایک گز دُور تھا۔ وہاں جا کر پینگ آگے کو نہیں بلکہ اُوپر کو چلی جاتی تھی....

"مَیں نے ہلارے کو اور لمبا کرتے ہوئے ایگل سے کہا 'ایک ہاتھ بڑھاؤ۔ ڈنڈا ایک ہاتھ سے پکڑے رکھو' یہ خودکشی کے برابر حرکت تھی، لیکن اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ مَیں جب ہلارے میں اُس کی طرف گیا تو دیکھا کہ ایگل ایک ہاتھ سے لٹک رہا تھا اور اُس نے دوسرا بازو میری طرف بڑھا دیا تھا۔ یہی لمحہ فیصلہ کُن لمحہ تھا ـــ زندگی یا دونوں کی موت ـــ اب میں نے بھی موت کو قبول کر لیا تھا اور اپنے جسم کو اُلٹا لٹکائے ہوئے اور آگے کرنے کے لیے ٹانگوں کی گرفت ڈھیلی کر دی تھی....

" مَیں اس ہلارے میں جو میری زندگی کا آخری ہلارا ثابت ہو سکتا تھا، دونوں ہاتھ بڑھائے اور چیل کے جھپٹے کی طرح ایگل کی کلائی میرے ہاتھوں میں آگئی۔ اُس نے میری ایک کلائی مضبوطی سے پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ سے ڈنڈا چھوڑ دیا۔ وہ میری عمر اور جسم جُثّے کا آدمی تھا۔ جب یک لخت اُس کے جسم کا سارا وزن میرے ہاتھوں میں آیا تو مَیں نے اپنی پینگ کے ڈنڈے پر اپنی ٹانگوں کی گرفت مضبوط کر لی لیکن ایگل کے وزن سے یوں لگا جیسے میرے بازو کندھوں سے نکل آتے ہوں اور پینگ کا ڈنڈا تلوار کی طرح میری ٹانگوں میں اُتر گیا ہو لیکن یہ زندگی اور موت کا مسئلہ تھا....

"میں نے تمام تر طاقت صرف کر کے ایگل کو اٹھائے رکھا۔ وہ آخر فنکار تھا۔ اس نے پھُرتی سے ٹانگیں اُوپر کیں اور پاؤں ڈنڈے اور رسّے کے ساتھ پھنسا کر اُوپر ہو گیا۔ اس کی سانسیں پھُولی ہوئی تھیں....

"نیچے اتارنے والی پینگ قریب ہی لٹک رہی تھی۔ وہ اس پر کھڑا ہو گیا اور کارندے آہستہ آہستہ رسّہ ڈھیلا کرنے لگے۔ پھر مجھے بھی اُتار لیا گیا۔ جال ابھی پھیلایا جا رہا تھا....

"میں نیچے اُترا تو رانی نے ایگل کو اپنے سینے سے چپکا رکھا تھا اور زار و قطار رو رہی تھی۔ جب میں نیچے اُترا تو وہ بھاگ کر میری طرف آئی اور اسی طرح مجھے اپنے سینے اور جوانی سے دہکتے ہوئے جسم سے چپکا لیا۔ اُس نے روتے روتے کہا ——— "ایزی! تم اپنے بھائی کو تو نہیں بچا سکے تھے، تم نے میرے بھائی کو بچا لیا ہے"....

"میں نے چونک کر اسے اپنے جسم سے الگ کیا اور حیرت زدہ ہو کے پوچھا ——— "بھائی؟.... کون؟.... ایگل تمہارا بھائی ہے؟"....

"تمہیں معلوم نہیں ایزی؟" اس نے میری طرح حیرت زدہ ہو کے کہا۔ "ایگل میرا سگا بھائی ہے۔ تم نے مجھے اس کے پاس ایک ہی پلنگ پر لیٹے ہوئے نہیں دیکھا تھا؟"

"اس نے میرے کان میں کہا ——— "تم جانتے ہو ایزی، مجھے تم سے کتنی محبت ہے؟ ایگل کو بھی معلوم ہے"....

"یکایک میرے سارے وجود میں سکون کی ایسی لہر دوڑ گئی جیسے میں نے جمی کو مرنے سے بچا لیا ہو۔ میں ایگل کو کیا سمجھا تھا اور وہ کیا نکلا۔ میں نے اُسے بچا کر اپنے بھائی کی موت کا کفارہ ادا کر دیا تھا۔ میں نے اُسی وقت ڈیسوزا کو کہہ دیا کہ کل سے میں باقاعدہ رِنگ میں آیا کروں گا۔ صرف ایک درخواست کروں گا کہ میرے کرتب کے وقت اکیلا سائیڈ ڈرم نہ بجے۔ ڈیسوزا نے وعدہ کیا کہ سائیڈ ڈرم نہیں بجا کرے گا....

"اور میں ایک بار پھر رِنگ میں آ گیا۔ میں ہر رات کرتب دکھانے لگا۔ جمی کی جگہ مجھے ایگل مل گیا اور رانی کی ایسی محبت مل گئی جس نے ایک اور خونی ڈرامے کو جنم دیا۔ میرے کھیل کے دوران سائیڈ ڈرم کبھی نہ بجایا گیا تھا۔ آج ایک مدت بعد سائیڈ ڈرم کی وہی آواز سُنی تو جمی میرے سامنے آن کھڑا ہوا اور مجھ پر غشی طاری ہونے لگی۔ اچھا ہوا کہ آپ نے مجھے سنبھال لیا۔"

"وقت بہت گزر گیا ہے"۔ عزیز احمد نے کہا۔ "آپ کو گھر جانا ہوگا"۔

مجھے گھر تو جانا ہی تھا لیکن بوڑھے عزیز احمد کی جوانی کی پوری کہانی سُننے کے لیے میں میاں میر نہر کے کنارے ساری رات بیٹھنے کے لیے تیار تھا۔ اُس کے لب و لہجے میں اب اداسی نہیں رہی تھی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جیسے وہ سرکس کی اُسی دنیا میں جا پہنچا ہو جہاں وہ بوڑھا عزیز احمد نہیں، نوجوان ایزی تھا۔ ہمارے قریب سے کاریں گذرتی جا رہی تھیں۔ نہر کے پُل سے دو مال گاڑیاں اور تین پسنجر گاڑیاں بے ہنگم شور و غل بپا کرتی گذر گئی تھیں۔ میں اُس کی کہانی میں اس قدر جذب ہو گیا تھا کہ وقت بھی نہ دیکھا۔ شاید وقت کا احساس ہی مِٹ گیا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ اگر آپ کو گھر جانے کی جلدی نہ ہو تو میں پوری کہانی سُن کر اُٹھوں گا۔ اُس نے سگریٹ کا لمبا کش لے کر دُھواں اگلا اور کہنے لگا:

"رانی کے بھائی ایگل کو موت کے منہ سے نکال کر مجھے رُوحانی سکون محسوس ہونے لگا۔ بھائی کی موت کا دُکھ تو کم نہ ہو سکا البتہ وہ تلخی ختم ہو گئی جو مجھے پلنگ پر جاتے ہی پاگل بنا دیا کرتی تھی.... میں نے ڈیسوزا سے کہہ دیا کہ میں ہر رات پلنگ پر کرتب دکھایا کروں گا۔ میری اس ذہنی تبدیلی میں رانی کی محبت کا اثر بھی شامل تھا بلکہ یہ اثر غالب تھا۔ ڈیسوزا بہت خوش تھا کہ اُس کے سرکس کا ایگل جیسا فنکار مرنے سے بچ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بھی رِنگ میں جانے کا اعلان کر دیا تھا....

"اُس رات ہم سب خوشیاں مناتے رہے کہ موت جو سرکس کے رِنگ میں آ گئی تھی شکست کھا گئی ہے۔ ایگل، رانی اور میں نے سوچا ہی نہیں کہ پلنگ کا رسّہ کیوں ٹوٹ گیا تھا اور فنکاروں کو اُوپر لے جانے والی پینگ کا رسّہ ایک جگہ سے کیوں کمزور نظر آتا تھا۔ ہم سب نوجوان تھے، ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو کبھی نہ سوچا تھا اور اُس رات تو ہم کچھ بھی سوچنے کے موڈ میں نہیں تھے۔

ایگل اور رانی نے مجھے بہت دیر تک اپنے خیمے میں بٹھائے رکھا اور ہم خوش گپیوں میں مصروف رہے۔ ایگل اب میرا رقیب نہیں بلکہ چھوٹا بھائی تھا۔ وہ مجھے رانی سے زیادہ پیارا لگ رہا تھا...

"میں اپنے خیمے میں جانے لگا تو رانی بھی میرے ساتھ چل پڑی اور میرے خیمے میں آگئی۔ میں نے اُسے صاف الفاظ میں بتادیا کہ مجھے اس سے کتنی محبت ہے۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ میں ایگل کو اپنا رقیب سمجھتا رہا ہوں تو ہم دونوں کتنی ہی دیر ہنستے رہے۔ پھر ہم ایسے پیار کے نشے میں مدہوش ہو گئے جس کا سرچشمہ ہماری روحوں میں تھا....

"رانی پاک صاف اور بہت ہی حسین لڑکی تھی۔ اُس نے بلا جھجک کہہ دیا کہ وہ میرے ساتھ شادی کرے گی مگر شادی کے لفظ کے ساتھ ہی ہم دونو بُجھ کے رہ گئے کیونکہ ہم اُس وقت تک شادی نہیں کر سکتے تھے جب تک کہ ہمارے جسم پینگوں کے کرتب دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔ میری عمر ابھی انیس برس بھی نہیں ہوئی تھی اور رانی کی عمر سترہ برس تھی۔ ہم اگر بہت جلدی شادی کر لیتے تو بھی تیس سال کی عمر میں کر سکتے تھے، ورنہ ہمیں سرکس کو خیرباد کہنا پڑتا۔ ہم میں اور کوئی ہُنر نہیں تھا جس سے ہم کہیں اور جا کر روزی کما سکتے...

"میں نے رانی سے کہا ــــ 'تیرہ چودہ سال انتظار کر سکو گی؟' ــــ اُس نے حیرت سے آنکھیں کھول کر کہا ــــ 'تیرہ چودہ سال؟' ــــ وہ اداس ہوگئی۔ میں بھی گہری سوچ میں کھو گیا۔ اُس نے کہا ــــ 'اگر معلوم ہوتا کہ سرکس کی خاطر مجھے جوانی کی اُمنگیں قربان کرنی پڑیں گی تو میں یہ پیشہ کبھی اختیار نہ کرتی.... چودہ سال!.... جب ہمارے جسم اس قابل نہیں رہیں گے کہ بندروں کی طرح کود پھلانگ سکیں'....

"میں نے غمزدہ سی آواز میں کہا ــــ 'چودہ سال بعد ہم سرکس والوں کے معیار کے مطابق بڑھاپے میں داخل ہو جائیں گے'۔ خیمے میں گہرا سکوت

طاری ہوگیا جیسے سرکس کا ببر شیر تھوڑی تھوڑی دیر بعد دھاڑ کر توڑ دیتا تھا...

"ہم دونوں نے یوں ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لیے جیسے کوئی آسیبی قوت ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر رہی ہو۔ رانی نے سر میرے سینے کے ساتھ لگا دیا ــــ اُس کے کھلے ہوئے ریشمی بالوں کے لمس اور خوشبو نے مجھ پر نشہ طاری کر دیا۔ ہم ابھی عالمِ شباب میں تھے۔ زندگی کے فلسفوں کو نہیں سمجھتے تھے۔ دماغ پختہ نہیں ہُوئے تھے، ورنہ ہم سوچ لیتے کہ تیس سال کی عمر میں کوئی بوڑھا نہیں ہوا کرتا لیکن چودہ سال کی مدت ہمیں پوری صدی سے زیادہ لمبی معلوم ہو رہی تھی....

"خیمے کا پردہ ذرا سا ہٹا۔ خیمے میں لالٹین جل رہی تھی۔ میں پردے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے پردے کے ساتھ کسی آدمی کا ہاتھ اور تھوڑا سا بازو نظر آیا۔ باہر اندھیرا تھا اور راستے میں پردہ بھی حائل تھا اس لیے میں دیکھ نہ سکا کہ کون ہے۔ میں نے کہا ــــ 'آجاؤ بھئی، کون ہو؟'....

"میں نے رانی کو پرے کر دیا۔ پردہ گر پڑا۔ ہاتھ غائب ہو گیا۔ میں اس خیال سے آہستہ آہستہ اٹھا کہ سرکس کا کوئی آدمی مجھے ایگل کو اتنی دلیری سے بچانے پر مبارک باد دینے آیا ہو گا اور رانی کو دیکھ کر باہر رُک گیا ہے....

"میں خیمے سے باہر گیا تو باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کسی کے قدموں کی آہٹ بھی نہیں سنائی دے رہی تھی۔ گھوڑوں کے بڑے خیمے کے قریب مجھے ایک آدمی سائے کی طرح نظر آیا اور گھوڑوں کی اوٹ میں غائب ہو گیا۔ رانی بھی باہر آگئی۔ میں نے لاپروائی سے کہا ــــ 'معلوم نہیں کون تھا۔ شاید تمہیں میرے پاس دیکھ کر واپس چلا گیا ہے'....

"رانی نے سنجیدہ لہجے میں کہا ــــ 'وہ مجھ ہی کو دیکھنے آیا تھا۔ میں جانتی ہوں کون تھا'....

"میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر خیمے میں لے جاتے ہوئے کہا ــــ

'گولی مارو، جو کوئی بھی تھا۔ بدبخت نے اتنا اچھا موڈ بگاڑ دیا ہے'۔۔۔ مجھے توقع تھی کہ رانی عادت کے مطابق بچوں کی طرح ہنس پڑے گی لیکن وہ تپائی کے کونے پر بیٹھ گئی۔ جب میں نے اس کے چہرے کو دیکھا تو میں ٹھٹھک گیا۔ اس کے چہرے کی تازگی بجھی بجھی سی لگی اور وہ لالٹین کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔۔۔

"میں نے اُس کے دونوں کندھے تھام لیے اور پوچھا۔ 'رانی کیا بات ہے؟ معلوم ہوتا ہے وہ کوئی خاص آدمی تھا۔ وہ کون تھا رانی؟ مجھے تو صرف ایک ہاتھ اور تھوڑا سا بازو نظر آیا تھا'۔۔۔

"رانی نے لالٹین سے نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں بے چینی بلکہ گھبراہٹ دیکھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ دیر تک خاموش رہے گی مگر وہ اچانک بولی ۔۔۔ 'ایزی مجھے اب یاد آیا ہے کہ ہینگوں کے رسّے جو وہ پندرہ دن پہلے بدلے گئے تھے۔ تم جانتے ہو کہ رسّے اتنی جلدی نہیں ٹوٹا کرتے۔ رسّے توڑے گئے ہیں۔ تم نے دوسری ہینگ کا رسّہ دیکھا تھا؟ تم نے بتایا تھا کہ وہ ایک جگہ سے کٹ پھٹ گیا تھا۔ وہ بھی نیا تھا۔ ایزی، میں ڈیسوزا کو بتانا چاہتی ہوں کہ میرے بھائی کو اُوپر سے گرا کر مارنے کے لیے رسّے کمزور کیے گئے تھے'۔۔۔

"اُس کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں اُسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ یک لخت تپائی سے اُٹھی اور تیزی سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔ 'ایزی میرے ساتھ آؤ۔ ایگل اکیلا سویا ہوا ہے'۔ اور وہ باہر نکل کر تیزی سے اپنے خیمے کی طرف قدم اُٹھانے لگی۔۔۔۔

"میں نے اُس کے ساتھ چلتے ہوئے جھنجلا کر کہا ۔۔۔ 'رانی! ساری بات بتاؤ۔ تمہیں بیٹھے بٹھائے ہو کیا گیا ہے؟' ۔۔۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور دوڑ پڑی۔ وہ اور ایگل ایک ہی خیمے میں رہتے تھے۔ میں بھی اس کے پیچھے

دوڑا اور جب میں اُس کے خیمے تک پہنچا تو وہ خیمے میں جا کر باہر نکل آئی تھی۔ کہنے لگی ۔۔۔ 'وہ سویا ہوا ہے'۔۔۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ باہر گھاس پر بیٹھ گئی اور مجھے بھی بیٹھنے کو کہا۔۔۔۔

"میں اُس کے قریب بیٹھ گیا تو اُس نے کہا۔ 'میں جانتی ہوں تم بہت حیران ہو رہے ہو۔ میرے دل میں ایک شبہ تھا۔ آج اس ہاتھ نے جس نے تمہارے خیمے کا پردہ ہٹایا تھا، یہ شبہ پختہ کر دیا ہے۔۔۔۔ سنو ایزی! اب تم بھی چوکنے رہو۔ ایگل کی جان ہر وقت خطرے میں ہے۔ اُس کے قتل کی ایک کوشش ناکام ہو گئی ہے۔ اب ایک اور کوشش کی جائے گی۔ جب تم نے خیمے سے باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھا اور مجھے بتایا تھا کہ باہر کوئی نہیں تو میرے دماغ میں بجلی چمکی جس کی روشنی میں مجھے نظر آیا کہ یہ ہاتھ جس نے تمہارے خیمے کا پردہ اُٹھایا تھا، یہاں سے ہٹ کر میرے سوئے ہوئے بھائی کا گلا گھونٹنے کے لیے یا اُس کے دل سے خنجر پار کرنے کے چلا گیا ہے۔ اسی لیے میں اپنے خیمے کی طرف بھاگی تھی'۔۔۔۔

"میں نے حیرت اور جھنجلاہٹ سے پوچھا ۔۔۔ 'رانی بات کھل کر کہو۔ تمہارے دل میں کیا شبہ تھا؟' ۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ 'تم ڈیسوزا کے بیٹے کو جانتے ہو جو اپنے آپ کو چیمپیئن کہلواتا ہے اور اسی نام سے پکارا جاتا ہے'۔۔۔

"میں چیمپیئن کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ سرکس کے منیجر ڈیسوزا کا بیٹا تھا۔ عمر پچیس سال سے زیادہ تھی۔ وہ سرکس کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے یہ معلوم کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی کہ سرکس میں اس کی کیا حیثیت ہے۔ مجھے اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ ہر کسی کے کام میں دخل دیا کرتا تھا۔ میں جب ہاتھیوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا تو وہ مجھ پر بھی حکم چلایا کرتا تھا۔ آرکسٹرا مشق کر رہا ہو تو کنڈکٹر کو جا پریشان کرتا تھا۔ منیجر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے ہر کوئی اُسے برداشت کرتا تھا۔ میں نے یہ تو خاص طور پر دیکھا تھا کہ جب دن کے وقت ایگل اور رانی

مشق کیا کرتے تھے تو وہ تمام وقت وہاں موجود رہتا اور رانی کو دیکھتا رہتا تھا۔
اُس کی شکل وصورت تو اچھی سی تھی، جسم میں بھی کوئی خاص بات نہیں تھی،
نہ اُس میں کوئی اور وصف تھا۔ تاہم وہ اپنے آپ کو چیمپئن کہلواتا تھا۔ اس کی
حرکتوں اور باتوں میں اداکاری زیادہ ہوتی تھی اور اکثر ڈینگیں مارتا رہتا تھا....

"میں نے رانی کو بتایا کہ میں چیمپئن کو جانتا ہوں۔ رانی نے کہا ــــ تم نے شاید
نہیں دیکھا کہ وہ مجھے کس طرح بُھوکی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔ وہ کئی بار تنہائی
میں میرے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کر چکا ہے۔ میں اسے ہنسی مذاق
میں ٹالتی رہی لیکن وہ شاید یہ سمجھتا رہا کہ میں شرما رہی ہوں۔ اس غلط فہمی میں مبتلا
ہو کر ایک رات وہ میرے خیمے میں آگیا۔ ایگل خیمے میں نہیں تھا۔ چیمپئن نشے
میں تھا۔ اُس نے خیمے میں آتے ہی مجھے بازوؤں میں دبوچ کر اپنے ساتھ
لگا لیا اور منہ میرے منہ کے ساتھ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے جسم میں
بھی طاقت ہے۔ میں نے اپنے آپ کو اُس کے بازوؤں سے آزاد کرا لیا۔
عین اُس وقت ایگل آگیا۔ میں نے پوری طاقت سے چیمپئن کے منہ پر تھپڑ
مارا۔ اُس نے ابھی ایگل کو نہیں دیکھا تھا کیونکہ اس کی طرف اُس کی پیٹھ تھی۔
چیمپئن نشے میں جھومتا ہوا میری طرف لپکا تو ایگل نے پیچھے سے جھپٹ کر
اُس کے سر کے بال مٹھی میں لے لیے اور پیچھے کو جھٹکا جو دیا تو چیمپئن پیٹھ
کے بل گرا۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی تو ہم نے اُسے دھکے دے کر باہر نکال
دیا....

"رانی سے میں نے کہا کہ اُس نے مجھے کیوں نہیں بتایا تو اُس نے جواب
دیا ــــ ہم نے کسی کو بھی نہیں بتایا۔ میں اُس کے باپ کو بتانا چاہتی تھی لیکن
ایگل نے روک دیا اور کہا کہ وہ خود سنبھال لے گا.... دوسرے دن چیمپئن ایگل
سے ملا اور اس طرح بات کی جیسے رات کو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ کہنے لگا کہ ایگل میں
رانی کے ساتھ شادی کروں گا۔ اگر تم نے گڑبڑ کی تو سمجھ لو کہ اس سرکس سے تمہاری

لاش اُٹھے گی۔ ایگل نے اُس کے چیلنج کو قبول کر لیا اور اسے کہا کہ تم صرف
اُس وقت رانی کے ساتھ شادی کر سکو گے جب سرکس سے میری لاش اُٹھ
جائے گی۔ کل کی بات ہے کہ میں اور ایگل دن کے پچھلے پہر خیمے میں بیٹھے ہوئے
تھے کہ چیمپئن آگیا۔ وہ سٹول گھسیٹ کر ہمارے قریب بیٹھنے لگا تو ایگل نے
اسے کہا ــــ مسٹر! میں نے تمہیں بیٹھنے کی دعوت نہیں دی۔ جو بات کہنی ہے
کہو اور یہاں سے نکل جاؤ' ــــ چیمپئن سٹول پر بیٹھ گیا اور ہنس کر بولا ــــ
'ایگل! میں دوستوں کی طرح بات کرنے آیا ہوں۔ مجھ سے دشمنی مول لے کر تم بہت
بڑا خطرہ مول لے رہے ہو' ــــ ایگل نے گرج کر کہا ــــ 'اُٹھو اور باہر نکل
جاؤ'.....

"ایگل اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے غلطی کی جو اُس کی طرفداری کرتے ہوئے
ایگل سے کہا ــــ 'ایگل اس کی بات تو سُن لو۔ بدتمیزی نہ کرو' ــــ چیمپئن
یہ سمجھ بیٹھا کہ میں شاید اسے چاہتی ہوں۔ وہ دلیر ہو گیا اور وہ بھی اُٹھ کھڑا
ہوا۔ کہنے لگا ــــ 'میں تمہاری بہن سے شادی کر کے رہوں گا خواہ مجھے
تمہیں قتل ہی کرنا پڑے' ــــ میں جل اُٹھی اور بے قابو ہو کر ایک بھرپور
تھپڑ چیمپئن کے منہ پر جڑ دیا۔ ایگل نے ایک گھونسہ اُس کے پیٹ میں مارا
جس سے چیمپئن آگے کو دوہرا ہو گیا۔ ایگل نے دوسرا گھونسہ اُس کے منہ پر مارا
اور چیمپئن کئی قدم پیچھے جا پڑا۔ وہ اُٹھا اور خیمے سے نکل گیا'....

"رانی مجھے بات سنا رہی تھی اور میرا خون کھول رہا تھا۔ اُس سے دو روز
پہلے ڈیسوزا ایگل سے کہہ چکا تھا کہ وہ جال کے بغیر پینگ کے کرتب دکھائے۔
ایگل مان گیا تھا اور اس کی پبلسٹی بھی شہر میں ہو گئی تھی۔ آج رات کے شو
میں جو کچھ ہوا وہ تم نے دیکھ لیا ہے۔ پینگ کا رسہ ٹوٹ گیا اور تم نے اُوپر
لے جانے والی پینگ کا رسہ خود دیکھا ہے، وہ بھی ایک جگہ سے کمزور تھا۔
تھوڑی دیر پہلے جس ہاتھ نے تمہارے خیمے کا پردہ ہٹایا اور غائب ہو گیا تھا،

وہ یقیناً چیمپئن کا ہاتھ تھا۔ وہ مجھے دیکھنے آیا تھا۔ اُس نے مجھے اُس وقت دیکھا ہے جب میرا سر تمہارے سینے پر اور تمہارے گال میرے بالوں پہ تھے۔ وہ اب تمہیں بھی اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرے گا۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ وہ مجھے تمہارے پاس دیکھ کر ایگل پر سوتے میں وار نہ کر گیا ہو...

"رانی کا شبہ غلط نہیں تھا۔ رانی اتنی حسین اور ایسی دلکش لڑکی تھی کہ اس کی خاطر کوئی بزدل آدمی بھی قتل پر آمادہ ہو سکتا تھا۔ اگر چیمپئن کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کچھ کرتا... میں اور رانی اس مسئلے پر غور کرنے لگے کہ یہ معاملہ بہت سنگین ہو گیا ہے، ڈیسوزا کو بتا دینا چاہیئے۔ رانی نے مجھے بتایا کہ چیمپئن ڈیسوزا کا لاڈلا بیٹا ہے۔ وہ اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں سُنے گا۔ خاموش رہنا بھی خطرناک تھا۔ بہرحال ہم نے فیصلہ صبح تک کے لیے ملتوی کر دیا...

"صبح ایگل سے بات ہوئی تو اُس نے کہا کہ ڈیسوزا کو رسّے دکھائے جائیں اور اُسے اس کے بیٹے کی کارستانی بتائی جائے۔ ہم سرکس کے خیمے کے اندر گئے۔ دو کارندے پینگوں کے رسّے بدل رہے تھے۔ ہم نے دو نو پرانے رسّے اُٹھا لیے۔ چھوٹی پینگ کا رسّہ جو مجھے ایک جگہ سے کمزور نظر آیا تھا، رات کی نسبت اب زیادہ بوسیدہ ہو گیا تھا۔ وہاں سے اس کا رنگ ذرا گہرا بھی تھا اور اُوپر والی پینگ کا رسّہ جہاں سے ٹوٹا تھا، وہاں اس کا رنگ بدلا ہُوا تھا۔

ہم اتنا تو ضرور جان گئے کہ دونو رسّے کسی طریقے سے کمزور کیے گئے تھے لیکن ہم اتنے تجربہ کار نہیں تھے کہ طریقہ بھی جان لیتے...

"ہم تینوں رسّوں کو دیکھ رہے تھے کہ سرکس کا ایک جوکر ہمارے پاس آکھڑا ہُوا۔ وہ حیدرآباد دکن کا رہنے والا مسلمان تھا۔ اصلی نام محمود الحسنین تھا اور سرکس کی دنیا میں وہ اُغوٹ بمبو کے نام سے مشہور تھا۔ عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان تھی۔ اُسے ایگل اور رانی کے ساتھ بے پناہ محبت تھی۔ بعض اوقات بے تاب ہو کر دونو کو اپنے سینے سے لگا لیا کرتا تھا۔ اس بیا یہ

کا پس منظر جو ایگل اور رانی نے مجھے بتایا، یہ تھا کہ وہ خوش باش جوان تھا۔ اس کی بیوی اور دو بچے تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ حیدرآباد دکن میں کہیں ملازم تھا یا شاید کوئی کاروبار کرتا تھا۔ اس کی بیوی کو دِق ہو گیا۔ اُس زمانے میں دِق لاعلاج مرض تھا۔ اس آدمی نے سُنا ہے کہ فاقے کیے اور بیوی پر دولت لٹا دی مگر وہ مر گئی۔ پھر بچہ دِق کا شکار ہو کر مر گیا اور ایک ہی سال بعد بچی بھی مر گئی۔ کہتے ہیں کہ وہ پاگل ہو گیا تھا۔ پھر اُس نے شراب نوشی شروع کر دی اور قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔ اُٹھتے بیٹھتے ہنسنے لگا اور اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ وہ بہت ہی خوش ہے....

"ایک بار گرینڈ امپیریل سرکس اس کے شہر میں گیا تو اسے جوکر بہت اچھے لگے۔ اُس نے ڈیسوزا سے پہلے جو منیجر تھا، اس سے بات کی تو اُس نے اسے موقع دیا۔ وہ ایک کامیاب جوکر ثابت ہُوا۔ اُس وقت اس کی عمر تیس سال سے اُوپر تھی۔ اب وہ اس قدر کامیاب جوکر تھا کہ رِنگ میں آتا تھا تو تماشائی اس کی صورت دیکھ کر ہی ہنس ہنس کر دوہرے ہونے لگتے تھے....

"جب ایگل اور رانی رِنگ میں آئے تھے، نو دس سال کے بچے تھے۔ اغوٹ بمبو نے پہلے روز ہی انہیں گود میں لے لیا تھا۔ ایگل نے مجھے بتایا کہ ایک بار وہ ان کے خیمے میں بیٹھا ان کے ساتھ خوش گپیوں سے دل بہلا رہا تھا کہ ہچکیاں لے لے کے رونے لگا۔ اُس رات اُس نے ایگل اور رانی کو اپنے غم کی داستان سُنائی اور انہیں بتایا کہ ان دونو میں اسے اپنے بچے نظر آتے ہیں۔ اُس روز انہیں پتہ چلا کہ یہ شخص جو ہزارہا تماشائیوں کے قہقہوں کا سامان ہے، اپنے اندر کتنے دُکھ دفن کیے ہوئے ہے۔ اس کی رونی سی صورت کو دیکھ کر اپنے غم بُھلا دینے والوں کو معلوم نہ تھا کہ اس کے چہرے کے ایک ایک خط میں غم سموئے ہوئے ہیں۔ اسے رِنگ میں دیکھ کر قہقہے لگانے والے ہجوم میں کوئی ایک بھی نہ تھا جو اُس سے پوچھتا

"محمود الحسنین! تم خود بھی کبھی ہنستے ہو"....

"وہ کبھی نہیں ہنستا تھا۔ اس کی ہنسی اس کی بیوی اور دو بچے اپنے ساتھ قبروں میں لے گئے تھے۔ ان کے غم کو وہ لوگوں کو ہنسا کر ہلکا کر لیتا تھا یا ایگل اور رانی کے پیار میں اور شراب کی بوتلوں میں ڈبو دیا کرتا تھا۔ اس کی ساری تنخواہ شراب پر خرچ ہوتی تھی....

"میں جب اس سرکس میں آیا تو اُس نے مجھے بھی بیٹا بنا لیا۔ اُس روز سے پہلے جب ہم ٹوٹے ہوئے رسّوں کو دیکھ رہے تھے کہ انہیں کس طرح کمزور کیا گیا، ایگل اور رانی کو دیکھ کر اُس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر رونق اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آجایا کرتی تھی لیکن اُس روز اُس کے چہرے کا رنگ اور تاثر بدلا ہوا تھا۔ مسکراہٹ غائب تھی....

"اُس نے ہم تینوں کو غور سے دیکھا، پھر بولا — 'رسّے کو سونگھو' — ہم تینوں نے سونگھا تو عجیب قسم کی بدبُو محسوس ہوئی۔ اُس نے دھیمی آواز میں کہا — 'تیزاب' — اُس نے باری باری ہم تینوں کے چہروں کو دیکھا اور رسّے اپنے ہاتھ میں لے کر بولا — 'آؤ ڈیسوزا کے پاس چلیں' — اور وہ آگے آگے چل پڑا....

"ڈیسوزا گھوڑوں کے پاس کھڑا تھا۔ اغڑ بمبو نے رسّوں کے دونو ٹکڑے ڈیسوزا کی طرف بڑھا کر کہا — 'مسٹر ڈیسوزا، رسّے تیزاب سے کمزور کیے گئے تھے... ایگل کو جان سے مارنے کے لیے' — ڈیسوزا نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا تو اُس نے دھیمی سی آواز میں کہا — 'سونگھو' — ڈیسوزا نے سونگھا۔ پھر سونگھا اور ایک بار پھر سونگھ کر معلوم نہیں کیا نام لے کر کہا — 'تیزاب ہے.... یہ رسّوں پر کس نے ڈالا ہے؟' — اغڑ بمبو نے ڈیسوزا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا — 'آپ کے بیٹے ڈیسوزا جونیئر نے!'...

"ڈیسوزا نے بدک کر دبدبے سے کہا — 'کیا بکتے ہو محمود! سوچ کر بات

کرو۔ وہ میرا بیٹا ہے' — محمود عرف اغڑ بمبو نے نہایت خود اعتمادی سے کہا — 'اور جسے اُس نے رنگ میں قتل کرنے کی کوشش کی ہے، وہ میرا بیٹا ہے' — ڈیسوزا نے پوچھا — 'اُسے ایگل کے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟' — ایگل بول پڑا — 'اُس نے دو بار میری بہن پر دست درازی کی ہے اور میں نے دونوں بار اس کی پٹائی کی ہے۔ اُس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ وہ رانی کے ساتھ شادی کرے گا اور میں نے اس کا چیلنج قبول کر کے کہا ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں وہ میری بہن کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو اُس سے پوچھئے کہ اُس کی دائیں آنکھ کے نیچے جو نیلا نشان اور سوجن ہے، وہ کیوں ہے؟'....

"ڈیسوزا نے کہا — 'میں اُس سے پوچھ چکا ہوں۔ اس نے بتایا تھا کہ اُسے بکرے نے سینگ مارا ہے' — سرکس میں بکرے بھی کرتب دکھایا کرتے تھے۔ رانی بول پڑی — 'سینگ کا نہیں، وہ نشان میرے بھائی کے گھونسے کا ہے'..

"ڈیسوزا اپنے بیٹے کے خلاف ایسا سنگین الزام تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اُس نے محمود اور ایگل پر غصّہ جھاڑنا شروع کر دیا۔ محمود نے اسے روک دیا اور کہا — 'مسٹر ڈیسوزا، اس سرکس میں یا آپ کا بیٹا رہے گا یا ہم چاروں۔ اگر آپ بیٹے کو اتنی کھلی لگام دینا چاہتے ہیں کہ وہ ایگل جیسے فنکار کو بھی قتل کرنے سے گریز نہ کرے تو ہم چاروں اجازت چاہتے ہیں۔ رکما بائی کا سرکس کلکتہ میں ہے۔ اینڈی کا باپ اُسی سرکس میں ہے ہم وہاں جا رہے ہیں'...

"ڈیسوزا ایک وقت چار فنکاروں کا نقصان برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے سر جھکا لیا۔ پھر اچانک سر اُٹھا کر رعب سے بولا — 'میرے ساتھ آؤ' — ہم چاروں اُس کے ساتھ چل پڑے۔ اتفاق سے اس کا چہیتا بیٹا راستے ہی میں مل گیا۔ ڈیسوزا نے اُسے بلا کر ایگل سے کہا کہ وہ ایک بار پھر ساری بات سنائے....

" ایگل نے ساری بات سُنا دی۔ رانی نے تفصیل سے بتایا کہ اُسے چیمپئن کس طرح دِق کرتا رہا ہے۔ چیمپئن نے انہیں جھٹلانے کی کوشش کی لیکن ایگل اور رانی نے اس کا جُرم ثابت کر دیا۔ ڈیسوزا کے ہاتھ میں رسّے کا ٹکڑا تھا۔ اُس نے اسی سے بیٹے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ ہم چاروں تماشہ دیکھتے رہے۔ باپ بیٹے کو بے دردی سے پیٹ رہا تھا۔ چیمپئن گرا تو باپ نے اسے ٹھڈے مارنے شروع کر دیئے۔ آخر محمود نے اُسے روک دیا۔ ڈیسوزا نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ 'چار آرٹسٹ ضائع کر کے سرکس کو ویران نہیں ہونے دوں گا'....

"مجھے بتایا گیا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ ڈیسوزا نے اپنے بیٹے کو اس طرح بے دردی سے پیٹا ہے، ورنہ وہ اس سے دیوانہ وار پیار کیا کرتا تھا اور اسی پیار نے اُسے بگاڑ دیا تھا۔ ڈیسوزا اس کی پٹائی کر کے ہمارے ساتھ کوئی بات کیے بغیر چلا گیا۔ چیمپئن نے ہم تینوں کو گھور کر دیکھا اور وہ سرکس کے بڑے خیمے کی طرف چلا گیا۔ ہم وہیں کھڑے محمود کو دیکھنے لگے۔ ہم پر گھبراہٹ طاری تھی کیونکہ ہم ایسی صورتِ حال سے کبھی دوچار نہیں ہوئے تھے....

"محمود ہمیں اپنے ساتھ لیے ایگل اور رانی کے خیمے کی طرف چل پڑا۔ ہم سب پر خاموشی طاری تھی۔ میرا دل بوجھل تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ محمود کوئی بات کہے اور ہمارا اعصابی تناؤ کم ہو مگر وہ گہری سوچ میں سر جھکائے ہمارے آگے آگے چلا جا رہا تھا۔ خیمے میں داخل ہو کر ہم سب بیٹھ گئے....

"محمود نے گہری سوچ سے نکل کر کہا ـــــ 'خطرہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ شاید زیادہ ہو گیا ہے۔ دیکھو بچّو، میں اپنے طور پر اس لڑکے پر نظر رکھوں گا۔ تم اپنے طور پر ہوشیار رہنا۔ ڈیسوزا نے اپنے بیٹے کو پیٹا تو ضرور ہے لیکن وہ آخر اُس کا بیٹا ہے۔ وہ اسی کی طرفداری کرے گا۔ اس پٹائی سے چیمپئن سنور نہیں جائے گا بلکہ وہ اور زیادہ مشتعل ہو گا.... اور اب وہ کوئی اور اوچھی حرکت کرے گا۔ ہو سکتا ہے وہ تمہارا دوست بننے کی کوشش کرے، لیکن اس کی کسی بات پر دھیان نہ دینا۔ یہ نہ بھولنا کہ اس کی رگوں میں ہندو ماں اور انگریز باپ کا خون ہے۔ دونوں خون ناپاک ہیں'....

"محمود ہمیں تسلی دلاسے دے کر چلا گیا مگر میں نے دیکھا کہ وہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ تھا اور اُس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی خیال یا کوئی اندرونی خلش اُسے پریشان کر رہی ہے....

"اُس رات ہم نے بدلے ہوئے رسّوں کو اچھی طرح دیکھ کر پینگوں کے کرتب دکھائے۔ سرکس کے باقی آئیٹم بھی روزمرّہ کی طرح تسلّی بخش ہو گئے۔ رکما بائی کی سرکس کی طرح یہاں بھی یہ فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ پینگوں کے کرتب جال کے بغیر نہیں کیے جائیں گے۔ ہم نے سرکس میں صرف یہ تبدیلی دیکھی کہ چیمپئن غائب تھا۔ دوسرے دن بھی ہمیں چیمپئن کہیں نظر نہ آیا....

"شام کے وقت ڈیسوزا بہت ہی پریشان دکھائی دیا۔ میں اُس کے ساتھ کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے خود ہی مجھے روک لیا اور پریشان سے لہجے میں کہنے لگا ـ 'چیمپئن کل سے غائب ہے۔ تم لوگوں نے مل کر معلوم نہیں کیا ڈرامہ بنایا ہے کہ میرا لڑکا لاپتہ ہو گیا ہے'۔ میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ میں لڑکا ہی تو تھا...

"سات دن گذر گئے۔ چیمپئن واپس نہ آیا۔ سرکس کے شو چلتے رہے۔ محمود، اغڑ بمبو کے روپ میں تماشائیوں کو ہنسا ہنسا کر دوہرا کرتا رہا۔ میں بھی کی موت سے پہلے کی طرح رنگ کا شہزادہ بن گیا۔ طبیعت رنگ میں جم گئی۔ رانی اور میں ایک دوسرے کی محبت میں سرشار رہے مگر سرکس کی فضا میں کھچاؤ اور بے مزگی کا تاثر چھایا رہا۔ ڈیسوزا اُداس رہنے لگا اور محمود مجھے، ایگل اور رانی کو ملتا تو ایسے لہجے میں ہمیں چوکنا رہنے کو کہتا جیسے اس کی تجربہ کار نگاہوں کو کوئی خطرہ نظر آ رہا ہو..

"آٹھویں رات وہ خطرہ سرکس کی فضا سے زمین پر اُتر آیا اور اُترا اُس وقت جب رات گھُپ اندھیری تھی۔ سرکس کا شو ختم ہو چکا تھا۔ تماشائی جا چکے

تھے۔ کارندے اور فنکار سو گئے تھے۔ شاید رات کے ڈیڑھ بجے کا وقت تھا۔ شو ختم ہونے کے بعد محمود، ایگل اور رانی کے خیمے میں آیا تھا۔ میں بھی وہیں تھا۔ اس نے کہا تھا ——" وہ غلیظ خون کا یہ لڑکا وار ضرور کرے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کا یارانہ بمبئی کے غنڈوں کے ساتھ بھی ہے۔ گھٹیا درجے کے شراب خانوں اور رنڈیوں کے گھروں میں بھی جاتا ہے۔ تم تینوں ایک ہی خیمے میں رہو تو زیادہ محفوظ رہو گے .... اور اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو ہم چاروں رکما بائی کی سرکس میں چلے جائیں گے۔" اُس کا یہ ارادہ مجھے بہت اچھا لگتا تھا کیونکہ میں اپنے باپ کے پاس جانے کے لیے بے تاب رہتا تھا....

"محمود چلا گیا۔ میں اپنے خیمے میں جا کے سو گیا .... بے ہنگم غل غپاڑے اور لوگوں کی بھاگ دوڑ سے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر اس قدر شور اور بھاگ دوڑ تھی کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ مجھے صرف ایک آواز ذرا صاف سنائی دی۔ کوئی آدمی میرے خیمے کے قریب سے دوڑتا ہوا گزرا۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا —" جیری نکل گیا ہے" — اس کے ساتھ ہی مجھے جیری کی دھاڑ سنائی دی اور گھوڑے خوفزدہ آوازوں میں ہنہنا تے....

" میرا دم خشک ہو گیا۔ جیری سرکس کا ببر شیر تھا۔ آپ نے رکما بائی کا شیر دیکھا تھا۔ جیری اُس سے کم غصیلا نہیں تھا۔ اُس کے کرتب دکھانے والے کا نام فرنینڈس تھا۔ وہ اینگلو انڈین تھا۔ اُسے فیری کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ بہت دلیر انسان تھا۔ وہ جب ببر شیر کا کھیل دکھانے کے لیے سلاخوں والے رنگ میں داخل ہوتا تھا تو رنگ ماسٹر اعلان کیا کرتا تھا " اب جیری اور فیری کا مقابلہ دیکھیے ....

" جیری جب پنجرے سے نکل کر رنگ میں آتا تھا تو وہ ہیبت ناک گرج سے سرکس کے ماحول کو ہلا دیتا تھا۔ پھر وہ فیری پر حملہ کرتا تھا اور فیری پینترا بدل کر اپنے لمبے ہنٹر کو ہوا میں جھٹکتا تھا تو بندوق کی طرح کا دھماکہ سنائی دیتا تھا۔ فیری کے ایک ہاتھ میں بید کی ایک ہلکی پھلکی کرسی ہوتی تھی جو وہ آگے کر کے

شیر کو روک لیتا تھا۔ کئی بار ایسے ہوا کہ شیر نے تھپیڑ کی طرح پنجہ مار کر اُس کے ہاتھ سے کرسی گرا دی۔ یہ صورت بہت خطرناک ہوتی تھی لیکن فیری ہنٹر جھٹکا جھٹک کر شیر کو کرتب دکھانے پر مجبور کر لیا کرتا تھا....

" یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ شیر سے کیا کرتب کرائے جاتے تھے۔ سٹول پر کھڑا کرنا۔ آگ کے بڑے کڑے میں سے گزارنا۔ اسے کھڑا رہنے پر مجبور کر کے رنگ ماسٹر اس کی پیٹھ پر بیٹھتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ مگر جیری سے یہ کرتب کرانے کیلئے فیری کو اپنی جان خطرے میں ڈالنی پڑتی تھی اور وہ رنگ میں شیر سے بچنے کے لیے پینترے بدل بدل کر، ہنٹر جھٹک جھٹک کر اور بائیں ہاتھ میں کرسی اٹھاتے تھک کر شل ہو جاتا تھا۔ اُس کی حفاظت کے لیے رنگ کی سلاخوں کے باہر دو آدمی ریوالور اٹھائے نالیاں شیر پر تانے رکھتے تھے....

" وہ جیری پنجرے سے نکل آیا تھا۔ رات اندھیری تھی۔ سرکس کے اڑھائی تین سو آدمی سوئے ہوئے تھے۔ ہاتھیوں، گھوڑوں، بکریوں اور بندروں کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ڈر یہی تھا کہ شیر کسی انسان کو نہ مار دے۔ جانوروں کو بچانا بھی ضروری تھا لیکن انسانوں کا نقصان برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خود اپنی جان کا بھی فکر تھا۔ جیری بہت ہی غصے سے گرج رہا تھا اور لوگ اندھا دھند بھاگ رہے تھے۔ میں نے ٹارچ اٹھائی اور خیمے سے نکل آیا....

" جیری کو صرف فیری سنبھال سکتا تھا مگر فیری کو جگانا آسان نہ تھا کیونکہ وہ پیتا بہت تھا۔ رنگ میں جانے سے پہلے وسکی کی آدھی بوتل پیتا تھا اور رنگ سے نکل کر اتنی زیادہ پی جاتا کہ بے سُدھ بستر پر گر پڑتا تھا۔ اُس کا خیمہ میرے قریب تھا۔ دُور سے ڈیسوزا کی آواز سنائی دی —" فیری .... فیری .... باہر آؤ فیری " — میں دوڑتا ہوا اُس کے خیمے میں گیا تو وہ باہر کے شور و غل سے لاتعلق خراٹے لے رہا تھا....

" میں نے اُسے جھنجھوڑا تو اس کے خراٹے چلتے رہے۔ میں نے بلند آواز

سے کہا —— "مسٹر فیری! جیری پنجرے سے نکل گیا ہے" —— جیری تو اُس کی زندگی کا ایک حصہ تھا۔ اُس کا نام سُنتے ہی فیری کے اُوپر پڑا ہُوا کمبل اُڑا اور فیری گیند کی طرح اُچھل کر فرش پر کھڑا ہو گیا۔ ہڑبڑا کر پوچھا "کیا کہا، جیری نکل گیا ہے"؟....

"میرے ہاتھ میں جلتی ہوئی ٹارچ تھی جس کی روشنی میں اُس نے تپائی سے ریوالور اُٹھایا۔ پیٹی کمر کے گرد باندھی۔ ریوالور میں چھ گولیاں بھر کر پیٹی میں ڈال لیا۔ ہنٹر اُس کے خیمے میں ہی تھا، وہ اٹھایا اور اس کے خیمے میں جو تین کُرسیاں رکھی تھیں وہ بید کی لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ یہ کُرسیاں بید کی خشک شاخوں کو دہرا کر کے بنائی جاتی تھیں جو خاصی ہلکی ہوتی تھیں۔ اس کُرسی کو اس طرح پکڑ کر آگے رکھا جاتا تھا کہ اس کی ٹانگیں شیر کے منہ کے سامنے رہتی تھیں۔ شیر جب غصے سے آگے بڑھتا تھا تو کرسی کی ٹانگوں کو دیکھ کر رُک جاتا تھا۔ اگر وہ پنجہ مارے تو کُرسی پر پڑتا تھا۔ یہ ایک حفاظتی انتظام تھا....

"اتنے میں شیر کی ایک اور گرج سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی دونوں ہاتھیوں کی ایسی چنگھاڑ سنائی دی جیسے شیر نے اُن پر حملہ کر دیا ہو۔ فیری کرسی اور ہنٹر اٹھا کر دوڑ کر باہر نکلا اور مجھے کہا "ایڈی ٹارچ کے ساتھ میرے ساتھ رہو، ڈرنا مت" —— اور مَیں اُس کے پیچھے دوڑ پڑا....

"مَیں نے محمود کی آوازیں سُنیں۔ وہ پکار رہا تھا —— "انکل، رانی.... کہاں ہو.... انکل، رانی" —— اور وہ تیز دوڑتا میرے قریب سے گزر گیا۔ وہ انکل اور رانی کے خیمے کی طرف جا رہا تھا۔ اُس وقت میں یہی سمجھا کہ اُسے ان دونوں کے ساتھ اس قدر پیار ہے کہ اسے اپنی جان سے زیادہ ان دونوں کی جان عزیز ہے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ بات کچھ اور تھی....

"سرکس بیس پچیس ایکڑ علاقے میں پھیلا ہُوا تھا۔ آج کی نسل نے تو نمائشوں اور میلوں میں یہ سرکس دیکھے ہیں جو چند گز زمین پر پھٹے پُرانے کپڑے تان کر بازی گروں

کا تماشہ دکھاتے ہیں۔ اُس دَور کے سرکس آپ نے دیکھے ہیں۔ جس شہر میں جا اُترتے تھے تو شہر کے اندر شہر آباد ہو جاتا تھا۔ رِنگ کا خیمہ تین منزلہ عمارت سے اُونچا ہوتا تھا۔ گرینڈ امپیریل سرکس ایسا ہی بڑا سرکس تھا جس کے فنکاروں اور کارندوں کی تعداد اڑھائی سَو کے لگ بھگ تھی۔ دیگر سامان اور جانور اتنے زیادہ ہوتے تھے کہ ایک لمبی مال گاڑی جس میں چھ ڈبے پسنجر گاڑی کے ہوتے تھے، سرکس نے ٹھیکے پر لے رکھی تھی....

"بمبئی میں سرکس کا پھیلاؤ اس طرح تھا کہ ایک شیر، دو چیتوں اور ایک شیرنی کے الگ الگ پنجرے تھے جن کے نیچے پہیے لگے ہوئے تھے۔ شو کے وقت پنجروں کو دھکیل کر سلاخوں والے رِنگ کے ساتھ لگا دیا جاتا تھا۔ رِنگ کا دروازہ پنجرے کے دروازے سے مل جاتا تھا۔ ایک آدمی پنجرے کے اُوپر کھڑا ہو کر پنجرے کا دروازہ اُوپر کو کھینچ لیتا تھا اور درندہ رِنگ میں آ جاتا تھا۔ شو کے بعد یہ پنجرے بڑے خیمے سے دُور رکھے جاتے تھے....

"جس رات جیری آزاد ہُوا، یہ پنجرے روزمرّہ کی جگہ رکھے ہوئے تھے۔ ان سے ہٹ کر دس بارہ گز دُور درندوں کی دیکھ بھال کرنے والے کارندوں کے خیمے تھے۔ ان کے ساتھ فالتو سامان کا بہت بڑا انبار تھا۔ انبار سے ذرا دُور کارندوں کے بیس خیمے تھے۔ ہاتھی الگ بندھے ہوئے تھے اور ان کے قریب دوسرے جانوروں کا اصطبل تھا جو ایک وسیع شامیانہ تھا۔ سرکس کے دوسرے پہلو کے ساتھ فنکاروں کے پچاس خیمے تھے اور اس طرح یہ خیموں کی ایک گنجان آباد بستی بنی ہوئی تھی جس کی گلیوں اور چھُپنے کی جگہوں میں سے شیر کو پنجرے تک جانے پر مجبور کرنا بہت دشوار تھا....

"سرکس کے تمام آدمی ادھر اُدھر بھاگ گئے تھے۔ شیر تھوڑی تھوڑی دیر بعد گرج یا غرّا کر نشاندہی کر رہا تھا کہ کہاں ہے۔ گھوڑے خوفزدہ آواز میں ہنہنا رہے تھے۔ بکریوں کی آواز بڑی ہی ڈراونی تھی۔ ہاتھی بھی رہ رہ کر چنگھاڑ رہے

تھے۔ ان کی آوازوں سے صورتِ حال کم از کم میرے لیے بہت ڈراؤنی ہو رہی تھی۔ درندوں کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں تو پتنگوں کا قلاباز تھا۔ اس لیے میں بہت خوفزدہ تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہی شیر جب پنجرے میں دھاڑتا تھا تو جانوروں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا مگر شیر کو کھلا دیکھ کر وہ خوف سے بلبلا رہے تھے۔۔۔۔

”اچانک شیر کی غراہٹ بند ہوگئی۔ میں ٹارچ کی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ شیر کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم جانوروں کے شامیانے کے قریب سے گذرے تو اچانک ایک چھوٹے خیمے کے قریب سے شیر اس طرح گرجا جیسے بم پھٹا ہو۔ میں بزدلوں کی طرح اُچھل کر پیچھے ہٹا۔ شامیانے کی رسّی سے پاؤں اُلجھ گیا اور میں گر پڑا۔ ٹارچ بھی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ شیر کی گرج کے ساتھ ہی مجھے فری کے ہنٹر کا پٹاخہ سنائی دیا اور اس کی گرجدار آواز ــــ ’جیری‘ ــــ بھی سنائی دی۔ میں اٹھ رہا تھا کہ فری نے کہا ــــ ’ایزی! کہاں ہو۔ اس کی آنکھوں میں روشنی مارو‘۔۔۔۔

”میں نے جلدی سے اُٹھ کر ٹارچ سنبھالی اور روشنی شیر کی آنکھوں پر مرکوز کر دی۔ وہ رُک گیا تھا مگر اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ کسی کا حکم نہیں مانے گا اور جو کوئی اس کے قریب گیا اُس کی خیر نہیں۔ وہ فری کو گھور رہا تھا اور آہستہ آہستہ غرّا رہا تھا۔ فری نے شیر پر نظریں جمائے ہوئے دھیمی آواز میں مجھے کہا۔ ’ذرا پیچھے رہو۔ ہنٹر کی زد میں نہ آنا۔ روشنی اس کی آنکھوں پر رکھنا‘۔۔۔۔

”فری نے ذرا آگے بڑھ کر پیار سے کہا ــــ ’کم آن جیری‘ ــــ اُس نے ایک اور قدم آگے اٹھایا تو شیر بڑے غصّے سے غرّایا اور ذرا آگے بڑھ آیا۔ فری نے کرسی کی ٹانگیں آگے کر دیں اور ہنٹر کو جھٹکا دیا۔ ہنٹر کے دھماکے سے شیر ذرّہ بھر نہ دبکا بلکہ اس نے زور سے کرسی پر پنجہ مارا۔ کرسی فری کے ہاتھ سے چھوٹ گئی جو اس نے اٹھالی۔ شیر دھاڑ کر پیچھے ہٹا جیسے اس نے کہا ہو ــــ

’میرے قریب نہ آنا۔ میں اب آزاد ہوں اور شیر ہوں‘ ــــ لیکن فری دلیر آدمی تھا۔ اُس نے تیزی سے آگے بڑھ کر ہنٹر ہوا میں جھٹکا اور کرسی زور سے آگے کی تو شیر دھاڑ کر پیچھے ہٹا۔ فری رُکا نہیں بلکہ اسی طرح کرسی کی ٹانگیں شیر کے سامنے کیے ہوئے آگے بڑھتا گیا۔ شیر پیچھے ہٹتا گیا اور میں ٹارچ کی روشنی شیر کی آنکھوں پر مرکوز کیے ہوئے فری کے ساتھ لگا رہا۔۔۔۔

”ہمیں قریب سے ڈیسوزا کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا ــــ ’فری، میں پیچھے سے اسے روکتا ہوں اور اسے پنجرے کی طرف گائیڈ کرتے ہیں‘ ــــ فری نے نظریں شیر پر گاڑے ہوئے جواب دیا ــــ ’نہیں مسٹر ڈیسوزا۔ جیری اچھے موڈ میں نہیں۔ تم جا کے اس کا پنجرہ دیکھو۔ یہ کیسے نکل آیا ہے؟ اگر پنجرہ ٹھیک ہے تو کسی کو پنجرے کے اوپر کھڑا کر دو اور دروازہ کھلا رکھو۔ شیر کو میں اُدھر لاتا ہوں۔ اگر پنجرے میں چلا جائے تو دروازہ نیچے دھکیل دینا۔ کوئی دلیر آدمی کھڑا کر دو‘۔۔۔۔

”ڈیسوزا دوڑتا گیا۔ شیر پیچھے ہٹتے ہوئے ایک خیمے سے ٹکرا گیا۔ اُس نے غصّے سے غرّا کر آگے کو ہلّہ کیا۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹا لیکن فری نے ہنٹر جھٹک کر اور کرسی کی ٹانگیں آگے کر کے اسے روک دیا۔ شیر رُک تو گیا مگر اُس نے اگلی ٹانگیں سکیڑ لیں۔ شیر شکار پر جھپٹنے سے پہلے ٹانگیں اسی طرح سکیڑ لیا کرتا ہے۔ فری نے مجھ سے کہا ــــ ’اگر یہ حملہ کرے تو بھاگنا مت۔ ایک طرف ہو جانا‘۔۔۔۔

”حملے کے لفظ سے ہی میرا دل ڈوبنے لگا۔ فری تو شیر کے مقابلے کا عادی تھا۔ میرا سامنا پہلی بار ہوا تھا۔ میں نے دبی آواز میں کہا ــــ ’فری ریوالور نکال لو‘ ــــ اُس نے لاپرواہی سے جواب دیا ــــ ’ضرورت نہیں۔ روشنی سیدھی رکھو‘۔۔۔۔

”میں نے ٹارچ سیدھی کر لی۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے شیر مجھے گھور رہا ہو۔ میرے ہاتھ کانپنے لگے۔ فری نے پیار سے اُسے بلایا ــــ ’جیری۔۔۔۔

"ہیلو بیری" ـــ اُس کے جواب میں شیر غرّا کر آگے بڑھا۔ فیری نے کرسی کی ٹانگیں آگے کر دیں اور ہنٹر کو جھٹک کر پٹاخنے کی آواز پیدا کی۔ شیر رُک گیا پھر اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگا۔ فیری بھی آگے بڑھنے لگا اور میں اس کے ساتھ ساتھ آگے ہو گیا۔ شیر گھوم گیا اور دو خیموں کے درمیان سے گزر کر پرے چلا گیا۔ فیری کودتا پھلانگتا اُس طرف گیا اور میں بھی ٹارچ اٹھائے دوڑا لیکن ڈر کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ شیر کہاں چلا گیا ہے....

"دونو ہاتھیوں نے بیک وقت چنگھاڑ کر زمین و آسمان کو ہلا ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی کسی کی چیخ سنائی دی۔ دُور سے ڈیسوزا کی بلند آواز سنائی دی ـــ 'فیری' شُوٹ اِٹ.... شُوٹ اِٹ فیری' ـــ میں نے بھی دوڑتے دوڑتے فیری سے کہا کہ اسے گولی مار دو مگر فیری نے بڑے غصے سے جواب دیا ـــ 'شٹ اَپ' ـــ اور وہ ہاتھیوں کی طرف دوڑا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی اُس طرف ڈالی تو شیر ہاتھیوں کے سامنے کھڑا اُن پر غرّا رہا تھا اور ہاتھی اس قدر زور سے اور اتنی کرخت آواز سے چنگھاڑ رہے تھے کہ اُن کی آوازوں سے اپنے جسم کی ہڈیاں الگ الگ ہوتی محسوس ہو رہی تھیں'....

"ہاتھیوں کی پچھلی ٹانگوں سے زنجیریں بندھی ہوئی تھیں جن کے دوسرے سرے زمین میں گہرے گڑے ہوئے لوہے کے کیلوں سے بندھے تھے۔ ہاتھی بھاگ نکلنے کے لیے بُری طرح آگے پیچھے اور دائیں بائیں کود رہے تھے۔ شیر اُن کے آگے ادھر اُدھر اس طرح بھاگ اور غرّا رہا تھا جیسے ان پر حملہ کرنا چاہتا ہو۔ وہ جدھر جاتا تھا ہاتھی گھوم کر اُس کے سامنے ہو جاتے تھے اور سونڈوں کو اوپر اٹھا اٹھا کر شیر کی طرف پٹخ رہے تھے جیسے اُسے سونڈ میں اُٹھا لینے کی کوشش کر رہے ہوں....

"اب شیر پُورے عتاب میں تھا۔ ہاتھیوں کو دیکھ کر وہ اپنے آپ کو جنگل میں سمجھ رہا تھا۔ ڈیسوزا بھاگا آیا اور فیری کے پیچھے آ کر بولا 'شُوٹ اِٹ،

ڈیم اِٹ۔ شُوٹ' ـــ لیکن فیری اب شیر سے زیادہ غصے میں تھا۔ اس نے کہا ـــ 'شٹ اپ مین۔ شٹ اَپ' ـــ اور بھاگ کر ہاتھیوں اور شیر کے درمیان جا کھڑا ہُوا۔ اُس نے مجھے پکارا۔ میں تو پیچھے ہی رُک گیا تھا۔ ہاتھی بھی بُری طرح بپھرے ہوئے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اب بھاگنے کی نہیں بلکہ شیر پر حملہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ زنجیریں نہ ہوتیں تو ایک خونریز معرکہ ہوتا....

"میں ڈر رہا تھا کہ ہاتھیوں اور شیر کے درمیان گیا تو شیر سے بچ جاؤں گا مگر پیچھے سے ہاتھی سونڈ میں اُٹھا کر پٹخ دیں گے۔ وہ بھی تو غصے میں تھے، لیکن فیری خطرے میں چلا گیا تھا۔ میں بھی اس کے پہلو میں جا کھڑا ہُوا اور روشنی شیر کی آنکھوں میں ڈالی۔ میں چونکہ فیری سے ذرا پیچھے تھا، اس لیے ایک ہاتھی کی سونڈ مجھ تک پہنچ گئی جو مجھے کمر پر آہستہ سے لگی۔ میں بدک کر آگے ہو گیا۔ فیری نے کہا ـــ 'پیچھے رہو ایزی۔ ہنٹر سے بچو' ـــ میں نے گھبرا کر کہا۔ 'پیچھے ہاتھی ہے اور مجھے سونڈ مار چکا ہے'....

"شیر غرّا کر آگے آیا تو فیری نے کرسی آگے کر کے ہنٹر کو جھٹکا دیا مگر شیر بہت آگے آ گیا تھا جس سے ہنٹر پٹاخنے کی آواز پیدا کرنے کی بجائے شیر کے سر پہ لگا۔ یہ ہنٹر صرف آواز پیدا کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، شیر کو مارا نہیں جاتا اور نہ شیر اُسی وقت انتقام لے لیتا ہے۔ اتفاق سے وہ غلطی ہو گئی تھی۔ شیر تیزی سے پیچھے ہٹا اور اُس نے چاروں ٹانگیں سکیڑ کر جسم زمین سے لگا دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ ضرور حملہ کرے گا اور جو اس کی زد میں آ گیا اسے چیر پھاڑ دے گا لیکن فیری بہت تیز تھا۔ اُس نے ایک جست میں آگے بڑھ کر کرسی کی ٹانگیں اس کے منہ کی طرف کر کے ہنٹر سے دھماکہ پیدا کیا تو شیر حملے کی پوزیشن سے اُٹھ کر پیچھے ہٹ گیا لیکن اب اس کی گرج نے سینہ ہلا دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی ہے....

"ڈیسوزا نے قریب آ کر کہا 'پنجرہ بالکل ٹھیک ہے۔ دروازہ بند تھا۔ میں

حیران ہوں کہ یہ کس طرح باہر آیا ہے'۔ یہ راز تو بعد میں فاش ہو گیا تھا کہ شیر پنجرے سے نکلا نہیں بلکہ نکالا گیا تھا، اور ایسے وقت نکالا گیا جب سرکس کا ہر فرد و بشر سو گیا تھا۔ میں اور فیری تو شیر کو پنجرے کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ہمیں معلوم نہ تھا کہ دوسری طرف خیموں اور سرکس کی دوسری بھول بھلیوں میں ایک اور پُراسرار تعاقب ہو رہا تھا جو جرم و جاسوسی کے اس خوفناک ڈرامے کا ایک اور منظر تھا۔ یہ منظر مجھے بعد میں محمود عرف اغوا بمبو نے سنایا تھا۔ میں آپ کو یہ بھی ساتھ ساتھ سناتا جاتا ہوں ....

"جب میں فیری کو جگا کر اس کے خیمے سے نکل رہا تھا تو مجھے محمود بھاگتا ہُوا اپنے قریب سے گزرتا دکھائی دیا تھا۔ اس سے پہلے میں نے اس کی پکار سُنی تھی —— 'اینگل۔ رانی .... کہاں ہو' —— وہ اُن کے خیمے کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ جب وہ ان کے خیمے کے قریب پہنچا تو اُسے خیمے کے پہلو میں تین آدمی نظر آئے جو سرکس کے دوسرے آدمیوں کی طرح ڈر سے اِدھر اُدھر بھاگ نہیں رہے تھے بلکہ چوروں کی طرح آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ اندھیرے میں اُسے تینوں آدمی ایک سائے کی طرح دکھائی دیے۔ محمود نے انہیں للکارا تو وہ خیمے کی اوٹ میں ہو گئے۔ اتنے میں اینگل اور رانی بھی باہر کے شور سے جاگ کر باہر نکل آئے۔ محمود نے دونوں سے کہا کہ خیمے کے پیچھے جاؤ۔ میں اِدھر سے آتا ہوں۔ اِن آدمیوں کو روکو....

اتفاق سے محمود نے سرکس کے بھاگتے ہوئے دو آدمیوں کو روک لیا اور ان سے کہا کہ شیر دوسری طرف ہے۔ تم اِدھر آؤ۔ تین آدمیوں کو پکڑنا ہے۔ محمود نے خیمے کے پیچھے جا کے دیکھا تو وہ آدمی ایک اور خیمے کی اوٹ میں ہو گئے تھے۔ اینگل اور دوسرے آدمیوں نے بھی انہیں دیکھ لیا اور ان کے تعاقب میں چل پڑے....

"محمود نے تین چار اور آدمی اکٹھے کر لیے اور بلند آواز سے انہیں ہدایات

دینے لگا۔ تمام آدمی بکھر کر اُن تین مشتبہ آدمیوں کو نرغے میں لینے کی کوشش کرنے لگے۔ محمود نے بلند آواز سے کہا —— 'اگر ان میں سے کوئی بھاگنے کی کوشش کرے تو گولی مار دو' —— حالانکہ کسی کے پاس نہ ریوالور تھا نہ بندوق اور محمود کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ اُن تین آدمیوں کے پاس کوئی ہتھیار ہیں یا خالی ہاتھ ہیں....

"اُدھر اُن تین آدمیوں کا تعاقب ہو رہا تھا جو خاصا مشکل تھا کیونکہ اندھیرا بہت گہرا تھا۔ خیموں اور دیگر سامان کی وجہ سے چھُپنے کی جگہیں بہت تھیں۔ اِدھر ہم دو آدمی بپھرے ہوئے شیر کو پنجرے کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ شیر اور زیادہ بپھر گیا تھا۔ فیری نے کرُسی کی ٹانگیں آگے کیں تو شیر نے دھاڑ کر اتنے زور سے پنجہ مارا کہ کرُسی فیری کے ہاتھ سے نکل کر دُور جا پڑی....

"فیری شیر کی آنکھوں سے آنکھیں نہیں نکالنا چاہتا تھا۔ وہ کرُسی اٹھانے کو لپکتا تو شیر اس پر جھپٹ پڑتا۔ کرسی کے بغیر وہ محفوظ نہیں تھا۔ میں شیر کی آنکھوں سے ٹارچ کی روشنی نہیں ہٹا سکتا تھا۔ میں نے روشنی وہیں مرکوز رکھی اور لیٹ کر ایک ٹانگ لمبی کی۔ میرا پاؤں کرسی تک پہنچ گیا۔ مجھے ذرا لیٹنا پڑا۔ میں نے لیٹ کر کرسی کو پاؤں سے گھسیٹ لیا اور فیری نے لپک کر کرسی اٹھا لی۔ شیر ایک طرف چل پڑا، لیکن رُک رُک کر پیچھے دیکھتا اور پھر چل پڑتا تھا....

"اُدھر محمود اور اُس کی پارٹی اُن تین آدمیوں کو ڈھونڈ رہی تھی۔ اُس نے بعد میں بتایا کہ وہ الگ نہیں ہوتے تھے۔ اکٹھے ایک سائے کی طرح نظر آتے تھے اور وہیں کہیں غائب ہو جاتے تھے۔ محمود کے آدمیوں نے گھیرا ایسا بنا لیا تھا جس سے وہ نکل نہیں سکتے تھے۔ محمود نے انہیں گولی مار دینے کی دھمکی تو دے دی تھی مگر ڈر اُسے خود تھا کہ اُن میں سے کوئی گولی نہ چلا دے۔ یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ کسی خوفناک ارادے سے اینگل اور رانی کے خیمے کے ساتھ لگے کھڑے تھے اور وہ باہر کے آدمی ہیں۔ وہ ایک جگہ سے دوسری

جگہ رینگتے سرکتے جا رہے تھے اور اُن کے گرد گھیرا بھی حرکت کر رہا تھا....

"شیر آہستہ آہستہ دوڑنے لگا اور وہ اپنے پنجرے کے قریب سے گزر گیا۔ ہمیں سب سے زیادہ یہ ڈر تھا کہ شیر کہیں شہر کا رُخ نہ کر لے۔ ڈیسوزا ہمارے ساتھ تھا۔ فیری نے اُسے کہا —— 'مسٹر ڈیسوزا، آرکسٹرا والے دُور نہ بھاگ گئے ہوں تو انہیں کہو کہ کسی جگہ بیٹھ کر آرکسٹرا بجائیں'' —— اُس کا مطلب یہ تھا کہ آرکسٹرا وہی دُھن بجائے جو شیر کے کرتب کے وقت بجایا کرتے ہیں تاکہ شیر پر کھیل کا موڈ طاری کیا جائے.....

"ڈیسوزا دوڑا گیا اور کنڈکٹر کو آوازیں دینے لگا۔ توقع نہیں تھی کہ آرکسٹرا والے اتنی جلدی مل جائیں گے۔ شیر اب تیز دوڑنے لگا اور ٹارچ کی روشنی سے نکل گیا تھا۔ مَیں اور فیری دوڑ پڑے۔ تھکن سے جسم ٹوٹنے لگا تھا جس میں خوف کا اثر بھی تھا۔ فیری نے دوسری سمت سے آگے ہو کر شیر کو ہنٹر کے دھاکے اور کرسی سے روک لیا۔ مَیں نے بھاگ کر فیری کے قریب پوزیشن سنبھال لی اور روشنی اُس کی آنکھوں پر مرکوز کر دی۔ اب شیر کا عتاب زیادہ بڑھ گیا تھا۔ وہ غصّے سے غرّایا اور تیزی سے آگے بڑھا....

"فیری نے کُرسی آگے کی تو اُس نے کرسی کو اتنے زور سے تھپڑ مارا کہ کُرسی فیری کے ہاتھ سے چھُوٹ کر اُوپر اُڑی اور دُور جا گری۔ فیری نے ہنٹر کو جھٹکا دیا اور پیچھے ہٹا۔ مَیں اُس کے عقب میں چھُپ گیا۔ شیر بائیں طرف دوڑ پڑا اور گھوڑوں کے شامیانے میں جا گھسا۔ گھوڑوں نے کودنا اور بڑے زور زور سے ہنہنانا شروع کر دیا۔ اچانک شیر کی ایسی غراہٹ سُنائی دی جس میں چیخ کی آواز بھی تھی۔ فیری نے کہا' معلوم ہوتا ہے اسے کسی گھوڑے نے دولتی ماری ہے'.....

"فیری دوڑا۔ شامیانہ دو طرفوں سے کُھلا تھا۔ مَیں اب آگے نہیں جانا چاہتا تھا لیکن فیری نے مجھے اپنے ساتھ رکھا۔ شامیانے کے اندر جا کر ٹارچ کی

روشنی میں دیکھا۔ شیر ایک گھوڑے کی ٹانگ کو منہ میں لیے ہوئے جھنجھوڑ رہا تھا۔ دوسرا گھوڑا جو بالکل قریب تھا، وہ رسّہ تڑا رہا تھا۔ شیر اس کے پیچھے تھا۔ اس گھوڑے نے اس زور سے شیر کو دولتی ماری کہ اُس کے منہ سے گھوڑے کی ٹانگ چھوٹ گئی اور وہ ہماری طرف بھاگا۔ ہم راستے سے ہٹ گئے۔ گھوڑوں کے شور سے بمبئی کا شہر ہل رہا تھا.....

"شیر ہمارے قریب سے گزر کر ڈیسوزا کے خیمے کی طرف چلا گیا۔ اُس وقت فیری نے کہا —— 'اَیزی، اب سنبھل کر رہنا۔ شیر دولتی کا بدلہ ہم سے لے گا' —— مَیں نے اسے کہا —— 'ریوالور مجھے دے دو' —— اُس نے کہا —— 'نہیں اگر ضرورت پڑی تو مَیں خود فائر کروں گا' —— اور وہ شیر کے پیچھے بھاگا۔ مَیں بھی اُس کے ساتھ دوڑا تو اس نے کہا —— 'اب میرے پیچھے رہنا۔ شیر حملہ کرے تو ڈرنا مت۔ ایک طرف ہو کر گر پڑنا'....

"ہم دوڑتے گئے۔ مَیں نے ٹارچ جلائی تو مجھے دس بارہ گز دُور شیر جاتا نظر آیا۔ اس سے آگے ڈیسوزا کا خیمہ تھا۔ مجھے ٹارچ کی روشنی میں یوں دکھائی دیا جیسے دو تین آدمی خیمے کے قریب کھڑے ہوں۔ وہاں تک روشنی پوری طرح نہیں پہنچ رہی تھی۔ ہم آگے ہوئے تو اُن میں سے ایک آدمی ڈیسوزا کے خیمے میں گھُس گیا۔ عین اُس وقت مجھے آرکسٹرا کی وہی دُھن سنائی دی جو شیر کے کھیل کے وقت بجائی جاتی تھی۔ ڈیسوزا نے آرکسٹرا والوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں بیٹھ کر بجا رہے تھے....

"ایک آدمی ڈیسوزا کے خیمے میں گھُس گیا جسے مَیں پہچان نہ سکا اور دوسرے دو آدمی ایک طرف کو بھاگے اور ٹارچ کی روشنی سے نکل گئے۔ شیر ڈیسوزا کے خیمے تک پہنچ کر رُک گیا اور گھوم کر پیچھے دیکھنے لگا۔ ہم پہنچ گئے۔ فیری نے اُسے پکار کر ہنٹر کا دھماکہ کیا تو شیر غرّا کر خیمے کے اندر چلا گیا۔ خیمے کا ایک پردہ ذرا سا ہٹا ہُوا تھا۔ اندر لالٹین جل رہی تھی....

"خیمے کے اندر سے اُس آدمی کی چیخیں سنائی دیں جو تھوڑی دیر پہلے اندر چلا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شیر کی غراہٹ سنائی دی۔ پھر شیر اور اس انسان کی ایسی ہولناک آوازیں سنائی دیں جن سے صاف پتہ چلتا تھا کہ شیر اس آدمی کو بھنبھوڑ رہا ہے۔ فیری نے ریوالور نکالا اور دوڑ کر خیمے کے پردے کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ میں اب آگے نہیں جانا چاہتا تھا۔ انسان کی چیخیں ختم ہو گئی تھیں۔ مجھے ریوالور کا دھماکہ سنائی دیا۔ اس کے ساتھ ہی شیر دھاڑا۔ فیری نے ایک اور گولی چلائی پھر اُس نے چھ کی چھ گولیاں فائر کر کے ریوالور کا سلنڈر خالی کر دیا۔ شیر کی دھاڑ، گرج اور غراہٹ ختم ہو گئی۔....

"میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ فیری باہر نکل رہا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا کہ اُس کے چہرے سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ اُس نے ریوالور اور ہنٹر زور سے زمین پر پھینک دیئے اور دھڑام سے زمین پر بیٹھ کر سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ میں اس کے قریب گیا تو اُس نے سسکی لینے کے انداز سے کہا۔ 'ڈیسوزا کو بلا لاؤ'.....

"میں وہاں سے چلا ہی تھا کہ ڈیسوزا دوڑتا آیا۔ اُس نے فیری کو یوں بیٹھے دیکھا تو گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ 'ختم کر دیا فیری؟ کہاں ہے؟' — فیری نے آہستہ سے سر ہلا کر اُس کے خیمے کی طرف اشارہ کیا۔ ڈیسوزا خیمے میں گیا تو اُس نے شیر کی طرح دھاڑ مار کر کہا — 'مائی سن!' — (میرا بیٹا) — فیری اُٹھا اور سر جھکائے ہوئے ایک طرف چلا گیا.....

"میں خیمے میں داخل ہوا تو جو منظر دیکھا وہ ساری عمر نہیں بھولوں گا — شیر چھ گولیوں سے مرا پڑا تھا اور اس کے قریب ڈیسوزا کے بیٹے چیمپئن کی لاش پڑی تھی۔ اُس کا بایاں بازو کندھے سمیت اُس کی لاش سے کٹ چکا تھا۔ پیٹ اس طرح پھٹا ہوا تھا کہ انتڑیاں اِدھر اُدھر بکھر گئی تھیں — اور ڈیسوزا پاگلوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ اس کا گمشدہ بیٹا آٹھویں روز واپس آیا تھا مگر

باپ کو ملے بغیر شیر کا شکار ہو گیا تھا....

"میں ڈیسوزا کے خیمے سے باہر نکل آیا۔ دل پر بھیانک سا بوجھ گر پڑا تھا۔ جی میں آتی تھی کہ وہاں سے بھاگ کر اپنے باپ کے پاس رکما بائی سرکس میں چلا جاؤں۔ گھبراہٹ سے دماغ ماؤف ہو گیا تھا اور تھکن سے جسم دکھ رہا تھا۔ اندر خیمے میں ڈیسوزا دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا اور ذرا پرے کئی ایک آدمیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو میری طرف بڑھتی آ رہی تھیں....

"جب آوازوں کا یہ ہجوم قریب آیا تو میں نے دیکھا سرکس کے سات آٹھ آدمی دو آدمیوں کو بازوؤں سے پکڑے ہوئے لا رہے تھے۔ محمود، انگل اور رانی اس جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ یہ دو آدمی سرکس کے نہیں تھے.....

"میں نے محمود سے پوچھا — 'یہ کون ہیں؟' — انگل نے جواب دیا — 'چیمپئن کے ساتھی.... چور ہیں' — میں نے کہا — 'چیمپئن کو شیر نے مار ڈالا ہے' — سب پر سناٹا طاری ہو گیا۔ اب ڈیسوزا کی دھاڑیں خاموش تھیں....

"ڈیسوزا تو نیم پاگل ہو چکا تھا۔ ان دو آدمیوں کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے گئے۔ دوسرے دن ہم جب چیمپئن کو دفن کر کے واپس آ رہے تھے تو محمود نے ڈیسوزا کو بتایا کہ رات شیر کے حادثے کے علاوہ کیا ہوا تھا۔ اُس نے ان دو آدمیوں کو اُس کے سامنے کھڑا کر دیا....

"دونوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر ساری بات بتا دی جو مختصراً یوں ہے کہ جس روز چیمپئن کو باپ نے پیٹا تھا، وہ اُسی روز غائب ہو گیا تھا۔ ان آدمیوں نے بتایا کہ وہ ان کے ساتھ قمار خانوں اور قحبہ خانوں میں وقت گزارتا رہا ہے۔ اُس نے ان دونوں کو ساتھ ملا کر رانی کے اغوا کی سکیم بنائی۔ اس نے انہیں یہ نہ بتایا کہ وہ رانی کے ساتھ شادی کرے گا بلکہ یہ لالچ دیا کہ اتنی خوبصورت لڑکی

کو اغوا کر کے اس سے عصمت فروشی کرائیں گے اور دولت کمائیں گے۔ اس کے یہ دونوں ساتھی بمبئی کے پیشہ ور قمار باز اور جرائم پیشہ تھے۔ چیمپئن سات روز سرکس سے غائب رہا۔ آٹھویں رات یہ تینوں رانی کو اغوا کرنے کے لیے سرکس میں آتے....

"ان آدمیوں کے بیان کے مطابق چیمپئن نے یہ سکیم بنائی تھی کہ وہ شیر کو پنجرے سے نکال دے گا۔ آپ نے سرکس کے شیروں کے پنجرے دیکھے ہوں گے۔ ان کے دروازے پنجرے کی چھت پر کھڑے ہو کر اوپر کی طرف کھینچے جاتے ہیں۔ چیمپئن کے لیے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ شیر کو پنجرے سے نکالنے کی ضرورت یہ تھی کہ رانی چونکہ ایگل کے ساتھ رہتی تھی، اس لیے اسے سوتے میں اٹھا لانا ناممکن تھا۔ چیمپئن کو معلوم تھا کہ شیر کھل جانے سے سرکس والوں میں ہڑبونگ مچ جائے گی۔ نفسا نفسی کا عالم ہوگا، رات اندھیری ہے، ہر کوئی اندھا دھند بھاگ رہا ہوگا اور اس حالت میں رانی کو اٹھا لے جانا مشکل نہیں ہوگا۔ اس کام کے لیے اُس نے نہایت موزوں وقت مقرر کیا تھا یعنی جب سرکس کی دنیا سوئی ہوئی تھی....

"ان آدمیوں نے بتایا کہ چیمپئن شیر کا پنجرہ کھولنے کے لیے چلا گیا اور انہیں رانی کے خیمے کے پاس کھڑا کر گیا۔ شیر کو آزاد کر کے وہ بھی ان سے آملا اور تینوں اس انتظار میں کھڑے ہو گئے کہ ایگل اور رانی بھی جاگ اٹھیں اور گھبرا کر کسی طرف بھاگیں تو وہ اندھیرے میں رانی کو اُٹھا لیں، مگر ہڑبونگ مچتے ہی محمود سیدھا رانی اور ایگل کے خیمے کی طرف بھاگا۔ وہ تجربہ کار آدمی تھا۔ اُس نے بھانپ لیا تھا کہ پنجرے ایسے مضبوط ہیں اور ان کی ساخت ایسی ہے کہ کوئی درندہ باہر نہیں نکل سکتا۔ جب تک کہ اسے نکالا نہ جائے۔ اُس نے خطرے کی بُو پا لی اور جب وہ رانی کے خیمے کے قریب پہنچا تو اسے وہاں تین آدمی کھڑے نظر آئے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ان میں ایک چیمپئن ہے....

"محمود نے دوسرے آدمیوں کی مدد سے انہیں پکڑنے کی کوشش کی اور وہ تینوں چھپتے چھپاتے، گھیرا توڑنے کی کوشش میں ڈیسوزا کے خیمے تک پہنچ گئے۔ شیر کو دیکھ کر چیمپئن ڈیسوزا کے خیمے میں گھس گیا اور دوسرے دو بھاگ اُٹھے اور پکڑے گئے۔ اگر چیمپئن کو شیر مار نہ ڈالتا تو بھی اس پر شک نہیں کیا جا سکتا تھا، کیونکہ وہ اپنے باپ کے خیمے میں تھا لیکن شیر نے خیمے میں داخل ہو کر اُسے کوئی اور جرم کرنے کے لیے زندہ نہ رہنے دیا....

"ڈیسوزا نے یہ کہانی سُنی تو وہ اپنے بیٹے کی موت کے صدمے کے ساتھ اس الزام کو برداشت نہ کر سکا۔ اُس نے پاگلوں کی سی حرکتیں شروع کر دیں۔ اس پاگل پن میں وہ ہر کسی کو گالیاں دینے لگا۔ اُس نے ان دونوں آدمیوں کو آزاد کر دیا اور محمود، ایگل اور رانی کو اور مجھے بھی ننگی گالیاں دیں۔ جوان، لاڈلے اور اکلوتے بیٹے کی ایسی ہیبت ناک موت اُس کے لیے معمولی حادثہ نہیں تھا۔ اس کا دماغ ٹھکانے نہیں رہا تھا۔ اس نے ہمیں یہ بھی کہا کہ تم سب نے میرے بیٹے پر جھوٹے الزام عائد کر کے اُسے مجھ سے پٹوایا تھا، ورنہ وہ مجھ سے کبھی جدا نہ ہوتا۔ وہ میرے پاس واپس آگیا تھا مگر شیر نے اسے مار ڈالا....

"ڈیسوزا کی ذہنی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی۔ جس کا اثر سرکس کو تباہ کرنے لگا۔ ہم چاروں کا تو اُس نے جینا محال کر دیا۔ آخر ایک روز محمود، ایگل رانی اور میں اُس کے خیمے میں گئے اور اسے کہا کہ ہم سب کے لیے اور گرینڈ امپیریل سرکس کے لیے بہتر یہی ہے کہ ہم چاروں سرکس سے نکل جائیں....

"وہ پہلے ہی جلا بیٹھا تھا۔ اُس نے ہمیں بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ ہم خاموشی سے اُٹھے اور سامان باندھ کر اُسی شام کی گاڑی سے کلکتے کے لیے روانہ ہو گئے....

"رکما بائی کا سرکس ابھی وہیں تھا۔ باپ نے مجھے دیکھا تو مجھ سے لپٹ گیا۔ رکما بائی نے بھی مجھے گلے لگا لیا۔ جب مَیں نے تین اور فن کار اسے پیش کیے تو وہ خوشی سے ناچنے لگی....

"دو سال بعد رکما بائی کو پشاور میں اُس کے شیر نے چیر پھاڑ ڈالا۔ مَیں اُس وقت سرکس کے ساتھ نہیں تھا۔ مَیں امرتسر میں رہ گیا تھا۔ مشق کے دوران میں پینگ سے گر پڑا تھا۔ نیچے جال تو تھا لیکن میں جال کے کنارے پر گرا اور زمین پر جا رہا۔ بایاں بازو جسم کے نیچے تھا جس سے کلائی کی ہڈی جگہ سے ہل گئی۔ مجھے امرتسر ہسپتال میں داخل کر دیا گیا اور سرکس لاہور چلا گیا۔ وہاں سے سرکس چند اور شہروں میں ایک ایک ہفتے کے لیے رکتا پشاور پہنچا۔ میری ہڈی پلستر میں تھی اور ڈاکٹر مجھے چھٹی نہیں دے رہے تھے۔ رانی کا خط مجھے امرتسر ہسپتال میں ملا تھا جس میں اس نے رکما بائی کی اندوہناک موت کی خبر سنائی تھی....

"سرکس واپس آیا اور مَیں ٹھیک ہو کر اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ میری عمر پینتیس سال ہوئی تو ہم نے شادی کر لی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران سرکس ختم ہونے لگے اور بالکل ہی غائب ہو گئے۔ ہم بھی بوڑھے ہونے لگے تھے۔ ایک کاروبار شروع کر دیا۔ جب پاکستان بنا تو ہم ادھر آ گئے۔ پانچ سال گزرے رانی ہمیشہ کے لیے میرا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ محمود تو ہندوستان میں ہی مر گیا تھا۔ اینگل نے پاکستان میں آ کر جان دی.....

"آج اس بینڈ والے نے سائیڈ ڈرم بجایا تو میرے سامنے میرا چھوٹا بھائی جمی آن کھڑا ہوا اور لڑکپن کا دور یاد آ گیا۔"

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی اُٹھا اور ہم نہر کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ اُس نے کہا — "ایسے لگتا ہے جیسے جمی کو مرے صدیاں گزر گئی ہیں لیکن ڈرم کی آواز نے بتایا کہ جمی کو مرے ایک دن بھی نہیں گزرا۔" دیکھو۔ تمہارا چھوٹا بھائی تمہارے سامنے پینگ پہ کھڑا مسکرا رہا ہے۔" اس نے آہ بھر کر کہا —

"جمی کو اتنی جلدی نہیں مرنا چاہیئے تھا...."

ہم دھرم پورہ پھاٹک کے قریب جدا ہونے لگے تو مَیں نے اس سے ایک بار پھر ملنے کو کہا تو اس نے دوسری ملاقات کا وعدہ کر کے بتایا کہ وہ دھرم پورہ میں اپنی ایک شادی شدہ بیٹی سے ملنے آیا ہے اور صبح کی گاڑی سے پشاور جا رہا ہے۔ بہرحال میں نے کہانی لکھنے کا وعدہ اس امید پر پورا کر دیا ہے کہ عزیز احمد دوسری ملاقات کا وعدہ پورا کریں گے۔